بیع مؤجّل اور بیع مرابحہ

ادھار چیز نقد کے مقابلے میں زیادہ قیمت پر بیچنے کی شرعی حیثیت

عہد حاضر کے ایک اہم اقتصادی معاملے کے بارے میں

مولانا مفتی سیاح الدین کاکاخیلؒ کا محققانہ مقالہ

الحمدُ للہ ربّ العالَمین وَ الصّلوٰۃُ و السّلامُ عَلٰی سیّدِ المُرسلین و خاتَم النّبیّن و علٰی آلہ و اصحابہ اجمعین امّا بعد۔ فقہائے کرام کے ہاں دو اصطلاحی لفظ مستعمل ہوتے ہیں، بیع مؤجّل اور مرابحہ۔ پہلے ان دونوں کی تعریف اور حقیقت بیان کی جاتی ہے۔

بیع مؤجّل کی حقیقت اور اس کا جواز

جس طرح یہ جائز ہے کہ بائع و مشتری کے درمیان عقدِ بیع یوں ہو جائے کہ ثمن کی ادائیگی فی الحال ہو، اسی طرح یہ بھی جائز ہے کہ خود عقدِ بیع میں دونوں اپنی رضا مندی سے یہ طے کردیں کہ مشتری ثمن کی ادائیگی کچھ عرصہ کے بعد کرے گا۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ ادائیگی کی وہ میعاد معلوم و معین ہو۔ اس کو بیع مؤجل کہتے ہیں، یعنی ایسی بیع کہ جس میں ادائے ثمن کے لئے اجل یعنی میعاد مقرر کی گئی ہے۔ **وَصحّ البیع بِثَمن حالٍ وَبِثَمن مؤجّلٍ الٰی اَجلٍ معلوم** (درِّمختار) اور اس جواز کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ عدمِ جواز کی کوئی دلیل شارع سے منقول نہیں ہے، اس لئے اشیاء میں اباحتِ اصلیہ کے اصول کے مطابق یہ بھی جائز ہے۔ لیکن اس کے ساتھ جواز کے لئے ایک نقلی دلیل بھی موجود ہے۔ بخاری شریف ج ۱، ص ۱۷۷ اور مسلم شریف ج ۲، ص میں ہے:

عن عائشۃ رضی اللّٰہ تعالٰی عنہا اَنَّ النّبِیَّ صلّی اللّٰہ علیہ و سلّم اشتَرٰی طَعَامًا مِن یَھُودِیٍّ اِلٰی اَجَلٍ وَ رَھَنَہٗ دِرعًا مِن حَدیدٍ

"حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک یہودی سے کچھ غلہ (۳۰ صاع جو) میعاد پر خرید ا تھا اور (اس کے ثمن کے بدلے)

لوہے کی زرہ اس کے ہاں رہن رکھ دی تھی۔"

تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنے عملِ مبارک سے اس کا جواز ثابت ہوا۔ مگر فقہاءِ کرام نے اس بیع مؤجل کی حقیقت بتاتے وقت یہ نہیں لکھا کہ بیع مؤجل میں بائع اور مشتری آپس میں جو ثمن طے کرتے ہیں وہ اس شے کی اُس وقت کی عام بازاری قیمت سے زائد ہوتا ہے' تاکہ بیع مؤجل کے مفہوم میں یہ صورت بھی داخل ہو جائے اور بیع مؤجل کے جواز کے حکم کے ساتھ یہ بھی ثابت ہو جائے کہ یہ صورت بھی جائز ہے۔ اب رہی یہ بات کہ اگر ثمن کی زیادتی بائع نے اس لئے طے کی ہے کہ وہ اس کی وصولی کچھ عرصے کے بعد کرے گا اور وہ اپنے ذہن میں ادائے ثمن میں تاخیر کی وجہ سے یہ اضافہ کر رہا ہے اور مشتری اس اضافۂ ثمن کو اس لئے قبول کر رہا ہے کہ فی الحال اس کے پاس مال نہیں ہے کہ وہ بازار میں رائج الوقت قیمت پر نقد ثمن دے کر خرید سکے' تو یہ ایک ایسی صورت ہے جس پر علیحدہ بحث کی جاسکتی ہے کہ بیع بالاجل کی صورت میں رائج الوقت بازاری قیمت سے زیادہ ثمن لینا دینا شرعی احکام کے مطابق ہے یا نہیں ہے۔ لیکن اتنی بات بہرحال واضح ہے کہ بیع مؤجل کے مفہوم میں یہ لازماً شامل نہیں ہے۔ اور جب یہ کہا جائے کہ شریعتِ اسلامی میں بیع مؤجل بھی جائز ہے تو اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ جہاں تاجیل کے ساتھ میعاد کی مناسبت سے ثمن زائد طے ہوا ہو تو وہ بھی لازماً اس حکمِ جواز میں داخل ہے۔

مرابحہ کی حقیقت اور اس کا جواز

اسی طرح فقہاءِ کرام کے ہاں مرابحہ جائز ہے۔ اور اس کی صورت یہ ہے کہ ایک شخص نے کوئی چیز ایک متعین ثمن دے کر خریدی تھی' اب وہ فروخت کر رہا ہے اور ایک مشتری اس سے خرید رہا ہے۔ مگر باہمی رضامندی سے یہ طے ہوتا ہے کہ بائع نے جتنا ثمن دے کر یہ چیز خریدی ہے وہ صحیح بتلا کر کہتا ہے کہ اس پر میں آپ سے اس قدر نفع لے کر مجموعی طور پر اتنے ثمن کے بدلے فروخت کرتا ہوں اور مشتری اس پر اعتماد کر کے رضامندی کے ساتھ اس قدر نفع دینے پر آمادہ ہو کر خرید لیتا ہے۔

مرابحہ کے مفہوم میں لازماً یہ شامل نہیں ہے کہ مشتری وہ چیز ادھار لے رہا ہے۔ بائع اپنے ثمنِ خرید پر جو اپنا نفع متعین بتلا کر فروخت کرتا ہے' نفع کی وہ مقدار ایک ہوتی ہے' خواہ

مشتری ثمن نقد دے رہا ہو خواہ وہ کسی میعادِ مقررہ پر دینے والا ہو۔ مرابحہ کے مفہوم میں یہ شامل نہیں ہے کہ نقد کی صورت میں تو اپنا منافع کم متعین کرتا ہے اور ادھار کی صورت میں اپنا نفع زیادہ کر رہا ہے۔ مثلاً زید نے ایک گھوڑا ایک ہزار روپیہ ثمن دے کر خریدا۔ اب خالد وہ گھوڑا اس سے خریدنا چاہتا ہے۔ باہم یہ طے ہوا کہ زید نے گھوڑا جتنے پر خریدا ہے وہ دو سو روپیہ اس پر نفع لینا چاہتا ہے۔ اس لئے زید نے خالد سے کہا کہ میں نے یہ گھوڑا ہزار پر خود خریدا ہے' میں اس پر دو سو روپیہ نفع لگا کر بارہ سو روپیہ میں فروخت کرتا ہوں' آپ کو اس طرح بارہ سو روپیہ پر منظور ہو تو لے لیں۔ خالد اس کی صداقت پر اعتماد کر کے دو سو نفع دینے پر راضی ہو کر بارہ سو روپیہ پر خریدتا ہے تو بیع و شراء کی ایسی صورت کو مرابحہ کہتے ہیں۔ یہ دو سو روپیہ نفع وہ بہرصورت لگا رہا ہے' خواہ خالد نقد خریدے یا ادھار۔ لیکن اگر وہ یوں کہے کہ نقد لو گے تو دو سو روپیہ نفع لگا کر بارہ سو روپیہ ثمن لوں گا' اور اگر چھ مہینے بعد ثمن دو گے تو پھر تین سو روپیہ نفع ملا کر تیرہ سو روپیہ ثمن ہو گا' تو ادھار کی وجہ سے زیادہ نفع لگا کر یہ سو روپیہ زائد وصول کرنا مرابحہ کے مفہوم میں شامل نہیں ہے۔ اس پر بحث کی جائے گی کہ تاجیل کی وجہ سے یہ اضافہ شرعاً کیسا ہے' جائز ہے یا ناجائز!

عموماً بیع مرابحہ کا یہ معاملہ اس لئے کیا جاتا ہے کہ ایک خریدار کسی چیز کے فروخت کرنے والے کی سمجھ اور کاروباری مہارت پر اعتماد کر کے اور اس کو بیانِ مقدارِ ثمن میں سچا سمجھ کر اس سے وہ چیز خریدتا ہے۔ اس کو یہ اطمینان ہوتا ہے کہ اس بائع نے جو چیز خریدی ہے اور اب فروخت کر رہا ہے اس نے بالکل صحیح قیمت پر خریدی ہو گی۔ یہ ماہر ہے' تجربہ کار ہے' اس کو کسی چیز کی اصل مالیت کا اندازہ ہے۔ میں خود بازار میں کسی اور سے یہ چیز خریدوں تو شاید مجھے عمدہ چیز نہ مل سکے یا کسی سے دھوکہ کھا جاؤں ، صحیح قیمت کا مجھے علم نہیں ، شاید مجھے کوئی خراب چیز دیدے یا گراں کر کے دیدے۔ تو دراصل ان امور کے پیش نظر اس سے یہ طے کرتا ہے کہ آپ بتائیے کہ جتنے ثمن پر آپ نے یہ چیز خریدی ہے اس پر ایک متعین مقدار سے اپنا نفع لگا دو۔ بائع بتا دیتا ہے کہ میں نے خود یہ چیز اتنے ثمن میں خریدی ہے' یا ثمن اور اس چیز پر مزید اخراجاتِ حمل و نقل وغیرہ کے بعد مجھے اتنے پر پڑی ہے' اور اس پر مزید اس قدر متعین نفع میں لے کر فروخت کرتا ہوں۔ خریدار اس کے قول پر مطمئن ہو کر اس ثمن پر جو فروخت کرنے والے کے ثمنِ خریداری سے نفع کی مقدار پر زائد ہوتا ہے وہ چیز اس سے

خرید لیتا ہے۔ مرابحہ کے مستقل احکام ہیں جو کتبِ فقہ میں تفصیل کے ساتھ مذکور ہیں۔

بیعِ مؤجل اور مرابحہ میں مدت کی وجہ سے اضافہ

ادھار کی وجہ سے ثمن میں جو اضافہ کیا جاتا ہے اس کو عین ربٰوا' اور ربٰوا حقیقی کی طرح قطعی حرام نہیں کہا جاسکتا کیونکہ فقہائے کرام اور حضراتِ مفسرین نے حقیقی ربٰوا کی جو تعریف کی ہے اس کے مطابق یہ ربٰوا کی تعریف میں داخل نہیں ہے۔ **وَحَرَّمَ الرِّبٰوا** کی تفسیر میں حضراتِ مفسرین نے حقیقی ربٰوا کی تعریف یوں لکھی ہے کہ دَین پر میعاد گزر جانے کے ساتھ ساتھ ہر مہینے کچھ مزید اضافہ ہوتا رہے۔ امام رازی تفسیر کبیر میں لکھتے ہیں:

و اعلم ان الرّبا قسمانِ ربا النسیئۃ و ربا الفضل اما ربو االنّسیئۃ فھو الا مر الذی کان مشھورًا متعارفًا فی الجاھلیۃ و ذٰلک انّھم کانوا یدفعون المال علی اَنْ یّأ خذو ا کلّ شھرٍ قدرًا معیّنًا ویکون رأس المالِ باقیًا ثُمّ اِذا حل الدّینُ طالبوا المدیُون بِرأسِ المل فان تعذّر علیہ الاداء زادوا فی الحقّ و الاجل فھذا ھو الرّبا الذی کانوا فی الجاھلیۃ یتعاملون بھ۔ و اما ربا النقد فھو ان تباع منّ من الحنطۃ بمنوین منھا وما اَشبہ ذٰلک (تفسیر کبیر)

"ربٰوا کی دو قسمیں ہیں۔ ربوا النسیئہ وہ معاملہ ہے جو زمانہ جاہلیت میں مشہور و متعارف تھا اور وہ یوں تھا کہ ایک شخص دوسرے کو کچھ مال اس شرط پر دے دیتا کہ یہ ہر مہینہ اس سے ایک متعین مقدار لیتا رہے گا اور اصل دیا ہوا سرمایہ اسی طرح باقی ہوگا۔ اور جب اس ادھار لئے ہوئے مال کے واپس ادا کرنے کی وہ تاریخ آجاتی تو مدیون سے پورا سرمایہ طلب کرتا۔ اگر وہ ادا کرنے کا اہل نہ ہوتا اور ادائیگی اس کے لئے مشکل ہوتی تو یہ اور میعاد بڑھاتا اور ماہوار مزید اضافہ طے کرتا۔ یہ وہ جاہلیت والا سود ہے جس کا ان کے ہاں معاملہ جاری تھا۔ اور ربوا الفضل یا ربوا النقد یہ ہے کہ مثلاً ایک سیر گندم کے بدلے ہاتھوں ہاتھ دو سیر گندم کا تبادلہ کیا جائے۔"

امام رازی پھر لکھتے ہیں کہ **اما جمھور المجتھدین قد اتفقوا علی تحریم الربٰوا فی**

مشتری ثمن نقد دے رہا ہو خواہ وہ کسی میعادِ مقررہ پر دینے والا ہو۔ مرابحہ کے مفہوم میں یہ شامل نہیں ہے کہ نقد کی صورت میں تو اپنا منافع کم متعین کرتا ہے اور ادھار کی صورت میں اپنا نفع زیادہ کر رہا ہے۔ مثلاً زید نے ایک گھوڑا ایک ہزار روپیہ ثمن دے کر خریدا۔ اب خالد وہ گھوڑا اس سے خریدنا چاہتا ہے۔ باہم یہ طے ہوا کہ زید نے گھوڑا جتنے پر خریدا ہے وہ دو سو روپیہ اس پر نفع لینا چاہتا ہے۔ اس لئے زید نے خالد سے کہا کہ میں نے یہ گھوڑا ہزار پر خود خریدا ہے' میں اس پر دو سو روپیہ نفع لگا کر بارہ سو روپیہ میں فروخت کرتا ہوں' آپ کو اس طرح بارہ سو روپیہ پر منظور ہو تو لے لیں۔ خالد اس کی صداقت پر اعتماد کر کے دو سو نفع دینے پر راضی ہو کر بارہ سو روپیہ پر خریدتا ہے تو بیع و شراء کی ایسی صورت کو مرابحہ کہتے ہیں۔ یہ دو سو روپیہ نفع وہ بہرصورت لگا رہا ہے' خواہ خالد نقد خریدے یا ادھار۔ لیکن اگر وہ یوں کہے کہ نقد لو گے تو دو سو روپیہ نفع لگا کر بارہ سو روپیہ ثمن لوں گا' اور اگر چھ مہینے بعد ثمن دو گے تو پھر تین سو روپیہ نفع ملا کر تیرہ سو روپیہ ثمن ہو گا' تو ادھار کی وجہ سے زیادہ نفع لگا کر یہ سو روپیہ زائد وصول کرنا مرابحہ کے مفہوم میں شامل نہیں ہے۔ اس پر بحث کی جائے گی کہ تاجیل کی وجہ سے یہ اضافہ شرعاً کیسا ہے' جائز ہے یا ناجائز!

عموماً بیع مرابحہ کا یہ معاملہ اس لئے کیا جاتا ہے کہ ایک خریدار کسی چیز کے فروخت کرنے والے کی سمجھ اور کاروباری مہارت پر اعتماد کر کے اور اس کو بیانِ مقدارِ ثمن میں سچا سمجھ کر اس سے وہ چیز خریدتا ہے۔ اس کو یہ اطمینان ہوتا ہے کہ اس بائع نے جو چیز خریدی ہے اور اب فروخت کر رہا ہے اس نے بالکل صحیح قیمت پر خریدی ہو گی۔ یہ ماہر ہے' تجربہ کار ہے' اس کو کسی چیز کی اصل مالیت کا اندازہ ہے۔ میں خود بازار میں کسی اور سے یہ چیز خریدوں تو شاید مجھے عمدہ چیز نہ مل سکے یا کسی سے دھوکہ کھا جاؤں، صحیح قیمت کا مجھے علم نہیں، شاید مجھے کوئی خراب چیز دیدے یا گراں کر کے دیدے۔ تو دراصل ان امور کے پیش نظر اس سے یہ طے کرتا ہے کہ آپ بتائیے کہ جتنے ثمن پر آپ نے یہ چیز خریدی ہے اس پر ایک متعین مقدار سے اپنا نفع لگا دو۔ بائع بتا دیتا ہے کہ میں نے خود یہ چیز اتنے ثمن میں خریدی ہے' یا ثمن اور اس چیز پر مزید اخراجاتِ حمل و نقل وغیرہ کے بعد مجھے اتنے پر پڑی ہے' اور اس پر مزید اس قدر متعین نفع میں لے کر فروخت کرتا ہوں۔ خریدار اس کے قول پر مطمئن ہو کر اس ثمن پر جو فروخت کرنے والے کے ثمنِ خریداری سے نفع کی مقدار پر زائد ہوتا ہے وہ چیز اس سے

کے حساب سے اضافہ لوں گا' اگر ایک ماہ بعد دو گے تو ۱۰۲ روپے ہوں گے' دو ماہ بعد دو گے تو ۱۰۴ ہوں گے' اور تین ماہ بعد دو گے تو ۱۰۶ ہوں گے۔ بلکہ تاجر اپنے ذہن میں یہ سوچتا ہے کہ نقد ابھی ادا کرتا تو عام بازاری قیمت کے مطابق میں بھی سو روپیہ پر فروخت کرتا۔ اب چونکہ یہ شخص مجھے دو مہینے کے بعد ثمن ادا کرے گا تو اس سے کہتا ہے کہ میں اپنی یہ چیز ۱۰۴ روپے پر فروخت کرتا ہوں' اگر آپ اس کو دو ماہ کی میعاد پر ۱۰۴ روپے کے بدلے میں خریدنا چاہتے ہو تو خرید لو۔ خریدار کے پاس اگر رقم اس وقت موجود ہو اور بازار میں ہر دکان سے وہی چیز بعینہٖ سو روپیہ کو مل سکتی ہو تو وہ کیوں سو روپیہ کی چیز ۱۰۴ پر خریدے گا۔ وہ تہی دستی کی وجہ سے مجبور ہو کر کہتا ہے کہ خواہ چار روپیہ مہنگا دے رہا ہے مگر اپنی ضرورت پوری کرنے کے لئے ۱۰۴ پر خریدلوں گا اور خرید لیتا ہے۔ تو سود سے اس کا فرق دو وجہوں سے ہے' ایک تو یہ کہ دَین پر اضافہ نہیں بلکہ شروع ہی سے ثمن مہنگا بتلا دیتا ہے۔ وہ اضافہ محض اس کے ذہن میں ہے۔ نیز مدت کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ اس زیادتی میں اضافہ نہیں ہوتا۔ مثلاً اس صورت میں اگر کسی وجہ سے خریدار دو مہینے کے بعد بروقت ادائیگی نہ کرسکا اور ایک مہینہ مزید گزر گیا تو پھر بھی اس کا مطالبہ ۱۰۴ ہی کا ہوتا ہے' یہ نہیں کہتا کہ اب ۱۰۶ دو گے یا مزید دو مہینے گزر گئے تب بھی اس کا مطالبہ اسی ۱۰۴ کا ہوتا ہے' ۱۰۸ کا نہیں ہوتا اور اگر وہ ایک ماہ گزرنے کے بعد ۱۰۶ اور دو ماہ گزرنے کے بعد ۱۰۸ کا مطالبہ کرتا ہے تو پھر یہ اصل ثمن ۱۰۴ پر ربٰوا ہو جائے گا۔ اور اس کو قطعی حرام کہا جائے گا۔

الغرض یہ زیر بحث مسئلہ اگرچہ عین ربٰوا تو نہیں' مگر اس میں شک نہیں کہ یہاں ذہنیت وہی سود خوارانہ ہے۔ درحقیقت یہ صاف سود سے بظاہر اپنے آپ کو بچا کر ایک حیلہ کے ساتھ وہی سودی کام کررہا ہے۔ اور بہت سے شرعی مسائل کے پیشِ نظر یہ کہنا چاہیے کہ سود خوارانہ ذہنیت کے ساتھ جس حیلہ گری سے بھی ہو اگر اس قسم کا کاروبار کیا جائے تو وہ ناجائز ہے۔ اور خود احادیثِ صحیحہ میں اور فقہائے کرام کے اقوال میں اس قسم کے معاملات کو ناجائز کہا گیا ہے۔ اور اس بناپر یہ سمجھنا چاہیے کہ محض ادھار پر فروخت کرنے کی وجہ سے کسی تاجر کا سامانِ تجارت بازاری قیمت سے زائد فروخت کرنا جائز نہیں ہے۔ ایسا کاروبار اسلامی شریعت کے مزاج کے خلاف ہے اور اس سے معاشرہ میں وہ ساری خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں جو سودی کاروبار سے پیدا ہوا کرتی ہیں۔ معاشی توازن بگڑ جاتا ہے' ایک طرف غیر

طبعی طور پر دولت میں اضافہ ہو جاتا ہے' اور دوسری طرف عام معاشرہ میں غربت انتہا کو پہنچتی ہے اور ملک میں دو طبقے بن جاتے ہیں' طبقاتی کشمکش اور باہمی منافرت اور تحاسد و تباغض پیدا ہو جاتا ہے' دولت مند غریبوں کو حقیر اور بے قدر و قیمت سمجھتا اور ان کی تذلیل کرتا ہے اور غریبوں کا طبقہ دولت والوں کو دشمن کی نگاہ سے دیکھتا اور حسد کی آگ میں جلتا اور انتقامی تدبیریں سوچتا ہے۔ جب بھی کسی مملکت کا نظامِ معیشت اور کاروبارِ تجارت اسلامی احکام اور اسلامی حدود و قیود سے ہٹ کر ہو اس کے نتیجے میں آخر کار یہی مفاسد وقوع پذیر ہوتے ہیں۔

یہ ایک حیلہ ہے

کوئی طریقہ اور تدبیر سوچنا اور اس کو بروئے کار لانا جس کے ذریعہ سے اپنا ایک مقصد حاصل کیا جائے "حیلہ" کہلاتا ہے۔ یہ حیلہ حرام بھی ہوتا ہے' مکروہ بھی ہوتا ہے' اور جائز اور مباح بھی ہوتا ہے۔ اس وقت حیلہ کی یہ تقسیم اور اس کی مختلف صورتیں اور اس کی مختلف مثالیں بیان کرنا مقصود نہیں' یہ ایک مستقل موضوع ہے۔ البتہ اس خاص زیرِ بحث موضوع کے بارے میں کچھ عرض کرتے وقت یہ ذکر کرنا ضروری ہے کہ یہ بھی کاروبارِ تجارت میں اختیار کرنا اپنے مقصد اور مفاسد کے اعتبار سے حرام حیلہ ہے' یا اگر نرم الفاظ استعمال کئے جائیں تو مکروہ اور شریعتِ اسلامی کے اصل مزاج کے خلاف حیلہ ہے۔ کیونکہ سودی ذہنیت کے ساتھ سود کے مقصد کو پیش نظر رکھ کر کھلے سود کے بدلے میں اس کو اختیار کیا جا رہا ہے۔ تو ایک فاسد اور مفسد مقصد کے لئے اگر اس کے بدل کے طور پر بظاہر کسی دوسرے نام سے کوئی کام کیا جائے تو وہ جائز کیسے ہو سکتا ہے۔ علامہ ابن القیمؒ نے اعلام الموقعین میں لکھا ہے:

فالنية روح العمل و لبّه و قوامه و هو تابع لها يصحّ بصحتها و يفسد بفسادها

..... "نیت عمل کے لئے روح ہے اور نیت ہی پر عمل کا دارومدار ہے۔ عمل نیت کے تابع ہے۔ نیت صحیح ہو تو عمل صحیح ہے اور نیت فاسد ہو تو عمل فاسد ہے۔" آگے جا کر وہ لکھتے ہیں: **و هذا دليل على ان من نوى بالبيع عقد الربا حصل له الربا ولا يعصمه من ذٰلك صورة البيع** (ج ۳' ص ۱۱۱) اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ جس کسی شخص نے ظاہر میں تو بیع کی ہے مگر اس سے اس کی نیت وہی ہے جو عقد ربوٰا کی ہے تو اس کے لئے وہ ربوٰا ہو گیا' اور بیع کی یہ ظاہری صورت اس کو ربوٰا سے نہیں بچا سکتی۔" دوسری جگہ تحریر فرماتے ہیں:

علم ا ن ا لا غتبار فی ا لعقود و ا لا فعا ل بحقا ئقھا و مقا صد ھا دون ظو ا ھر الفاظھا و ا فعا لھا (ج ۳' ص ۹۵) "معلوم ہوا کہ عقود اور افعال میں اصل اعتبار ان کے حقائق اور مقاصد کو ہے' ظاہری الفاظ اور افعال کا اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔"

ایک اور جگہ علامہ ابن القیم کا ارشاد ہے: **و تجویز الحیل ینا قض سد الذرائع مناقضۃ ظاہرۃ فان الشار ع یسد الطریق الی المفاسد بکل ممکن و المتحیل یفتح الطریق الیھا بحیلتہفاین من یمنع من الجائز خشیۃ الو قو ع فی المحرم الی من یجعل الحیلۃ الی التوصّل الیہ** (ج ۳۔ ص ۱۵۹) حیلوں کو جائز قرار دینا سدِ ذریعہ کے مسئلے کے ساتھ کسی طرح بھی جوڑ نہیں کھاتا بلکہ صاف ظاہر طور پر اس کے خلاف ہے۔ اللہ تعالیٰ تو چاہتا ہے کہ ہر ممکن طریقہ سے مفاسد تک پہنچانے والے راستے کو بند کردیا جائے۔ اور حیلہ کرنے والا شخص تو حیلہ کے ذریعے ان مفاسد کی طرف لے جانے والا راستہ کھول دیتا ہے۔ تو شارع تو جائز کاموں کو بھی روکتا ہے اس خطرہ کے پیش نظر کہ حرام میں جا کر پڑے گا' اور حیلہ گر اس حرام تک پہنچنے کے لئے حیلہ کرکے راستے تلاش کررہا ہے"۔ تو حیلہ کرنے والے کا یہ عمل شارع کے مقصد کی بالکل ضد ہے تو یہ کہاں جائز ہو سکتا ہے۔ علامہ ابن القیمؒ ایک اور جگہ تحریر فرماتے ہیں:

> **ولھذا مسخ اللہ الیھود قرد ۃ لمّا تحیّلوا علی فعل ماحرّمہ اللہ و لَمْ یعصمھم مِن عقوبتہ اظھار الفعل المباح لما تو سّلوا بہ الی ارتکاب محارمہ و لھذا لعن الیھود لما اکلوا ثمن ما حرّم اللہ علیھم اکلہ و لَمْ یعصمھم التوسل الی ذلک بصور ۃ البیع و ایضًا فانّ الیھود لَمْ ینفعھم ازالۃ اسم الشحوم عنھا باذا بتھا فانھا بعد الا ذابۃ یفار قھا الا سم و تنتقل الی اسم الودک فلما تحیلوا علی ا ستحلا لھا با زالۃ الا سم لَمْ ینفعھم ذلک** (ج ۳ص ۱۱۳)

"اور اس لئے اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کو مسخ کرکے بندر بنا دیا تھا جب کہ انہوں نے اللہ کی طرف سے ایک حرام فعل کے کرنے کے لئے حیلہ اختیار کیا۔ اور ظاہر میں کئے ہوئے ایک فعلِ مباح نے ان کو حرام کے ارتکاب کی سزا سے نہیں بچایا کیونکہ انہوں نے ایک حرام کے ارتکاب کے لئے بطور ایک حیلہ کے یہ بظاہر

جائز کام کیا تھا۔ اس طرح یہود پر لعنت ہوئی جب کہ وہ اس چیز کو فروخت کرکے اس کے ثمن کو استعمال میں لے آئے جس کا خود کھانا اللہ نے ان پر حرام کردیا تھا۔ اور ظاہر میں بیع کی صورت نے ان کو لعنت کی سزا سے نہیں بچایا۔ نیز یہ بھی کہ یہودیوں کو شحوم (چربیوں) کے کھانے سے روکا گیا تھا۔ انہوں نے یہ حیلہ کیا کہ چربی کو پگھلا لیتے تھے اور پگھلانے کے بعد اس کا نام بدل کر "وَدک" ہوجاتا تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ نام کے بدل جانے سے اس کی حقیقت کو بدلا ہوا قرار دیں گے۔ اور اس پگھلے ہوئے کو وَدک کے نام سے کھالیتے تھے۔ لیکن اس نام کے بدل جانے سے حرمت کا حکم نہیں بدلا اور یہ حیلہ کوئی کارگر نہ ہوا۔ اور نام بدل جانے نے ان کو کوئی نفع نہیں دیا اور حرام کو حلال سمجھ کر حکم خداوندی کی خلاف ورزی کے جرم میں ملعون ہوئے۔"

اس کے بعد پھر علامہ ابن القیمؒ لکھتے ہیں:

قال الخطابی فی ھذا الحدیث بطلان کُلّ حِیلۃ یحتال بھا المُتوسّل إلی المحرم فانّہ لا یتغیّر حکمہ بِتغیّرِ ھیئتہِ و تبدیلِ اسمِہ (۱۱۲)

"علامہ خطابیؒ نے فرمایا ہے کہ اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ ہر وہ حیلہ جس کے ذریعے سے حرام کے ارتکاب تک پہنچا جائے وہ باطل ہے کیونکہ کسی چیز کی ہیئت اور نام کو تبدیل کرنے سے اس کا شرعی حکم نہیں بدلتا۔"

اور اس کے بعد علامہ ابن تیمیہؒ کا قول نقل کیا ہے کہ وہ فرماتے تھے کہ اس حدیث سے اس قسم کے حیلوں کے بطلان پر دلالت اس طرح ہوتی ہے جس کی طرف امام احمدؒ نے اشارہ فرمایا ہے کہ یہودیوں پر جب اللہ تعالیٰ نے شحوم (چربیوں) کو حرام کیا تو انہوں نے چاہا کہ کوئی حیلہ کرکے ان شحوم سے نفع ضرور حاصل کیا جائے، اور یہ بھی ہمارے بارے میں نہ کہا جاسکے کہ انہوں نے شحوم سے نفع حاصل کرکے حکمِ خداوندی کی نافرمانی کی ہے۔ یعنی فرمانبرداری کا بھرم بھی قائم رہے۔ تو انہوں نے اس کے لئے یہ حیلہ سوچا کہ اس کو پگھلا کر اس کی شکل کچھ بدل دی اور جس کا ودک نام ہوا، اور ارادہ یہ کیا کہ اس طرح شحوم کا نام تو باقی نہ رہا۔ اب اللہ تعالیٰ کی طرف سے حرام کردہ شحوم سے تو ہم انتفاع نہیں کررہے ہیں بلکہ وِدک سے انتفاع کررہے ہیں۔ حکمِ خداوندی میں تو وَدک کی حرمت نہیں ہے، شحوم کی ہے، پھر یہ بھی

کیا کہ اس کو فروخت کر کے اس کے عوض میں لئے ہوئے ثمن سے انتفاع کیا کرتے تھے' اور یہ کہتے تھے کہ ہم ثموم سے تو انتفاع نہیں کرتے۔ علامہ ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں:

و بدل الشیٔ یقوم مقامہ و یسدّ سدہ فاذا حرّم اللّٰہ الا نتفاع بشیٔ حرم الا عتیاض عن تلک المنفعۃ (۱۱۲)

"کسی شے کا بدل اس کا قائم مقام ہوتا ہے اور اس کی جگہ لے لیتا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ کسی شے سے نفع حاصل کرنا حرام کر دیتا ہے تو اس منفعت کا عوض لینا بھی حرام کر دیتا ہے۔"

علامہ ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں کہ یہودی اس لئے ملعون ہوئے کہ انہوں نے محض نام کے بدلنے سے حیلہ کر کے حرام کو حلال کر دیا اور ودک کے نام سے فائدہ اٹھانا چاہا مگر اس حیلہ گری سے ان کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا اور حرام کے مرتکب قرار پائے۔ اسی طرح اگر کوئی یہ حیلہ کرے کہ ربوٰا کی حرمت کی جو اصل وجہ ہے اس کے حاصل کرنے لئے ربوٰا کے نام سے نہیں بیع و شراء کے نام سے کوئی کام کرے تو اس نام کے بدل جانے سے اصل حقیقت نہیں بدلے گی اور حرمت باقی رہے گی۔ اور فرمایا:

فان الربوٰا لم یکن حرامًا بصورتہ و لفظہ و انما کان حرامًا لحقیقتہ التی استلزم بھا عن حقیقۃ البیع فتلک الحقیقۃ حیث وجدت و جد التحریم فی ای صورۃ رکبت و بایّ لفظ عبر عنھا فلیس الشان فی الاسماء وصورًا لعقود و انما الشان فی حقا نقھا و مقاصدھا و ما عقدت لہ (ج ۲' ص ۱۱۴)

"ربوٰا صرف ایک خاص صورت اور خاص لفظ کی وجہ سے حرام نہیں' بلکہ اس کی حرمت اس حقیقت کی وجہ سے ہے جس کی بناء پر وہ بیع کی حقیقت سے ممتاز ایک علیحدہ چیز ہے۔ تو یہ حقیقت جہاں بھی پائی جائے حرمت پائی جائے گی' خواہ وہ جس صورت میں جلوہ گر ہو اور جس لفظ سے بھی اس کی تعبیر کی جائے۔ اصل اہمیت عقود کی ظاہری صورتوں اور الفاظ کی نہیں ہے' اصل اہمیت ان اسماء و صور کی حقیقتوں' مقاصد اور ان امور کی ہے جن کے حصول کے لئے یہ صورتیں اختیار کی جاتی ہیں اور یہ نام رکھے جاتے ہیں۔"

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہو گئی کہ ظاہری صورت میں خواہ وہ بیع و شراء کے نام سے ایک عقد ہو' اور اس کو ربٰوا کے سوا کوئی اور نام دیا جائے' لیکن چونکہ یہ وہی مکروہ مفاسد معاشرہ میں پیدا کرتا ہے جو ربٰوا پیدا کیا کرتا ہے' اور صریحاً ربٰوا کے الزام سے بچنے کے لئے محض حیلہ گری کے طور پر اگر ان دوسری صورتوں کو اختیار کیا جائے' تو چونکہ حقیقت وہی ہوتی ہے تو یہ حیلہ کوئی فائدہ نہیں دے گا اور معاملہ کی یہ صورتیں بھی حرام اور ممنوع ہوں گی۔

ابتداء میں بھی یہ بات عرض کردی گئی ہے کہ زمانہ جاہلیتِ قدیمہ میں (اور زمانہ جاہلیتِ جدیدہ میں بھی) ایک صورت تو یہ ہے کہ کسی کو قرض دیا یا کسی اور وجہ سے کسی پر دَین لازم ہوا تو اس کے ساتھ یہ طے کیا جائے کہ ماہوار اس اصل سرمایہ پر اتنی مقدار مزید رقم دیا کرو گے' عربوں کے ہاں اس کا نام ربٰوا تھا۔ ابوبکر جصاص رازیؒ احکام القرآن میں لکھتے ہیں: **والربا الذی کانت العرب تعرفہ و تفعلہ انما کان قرض الدراھم و الدنانیر الی اجل بزیادۃ علی مقدار مااستقرض علی ماتیرا ضون بہ** (ج ۱، ص ۴۶۵) "وہ ربٰوا جس کو عرب جانتے تھے اور کیا کرتے تھے وہ یہ تھا کہ کسی کو دراہم و دنانیر کسی میعاد مقررہ تک قرض دیئے کہ جتنی رقم قرض لی ہے اس پر مزید اتنا اور دیں گے' جس پر وہ آپس میں راضی ہو جاتے تھے۔"
جب قرآن مجید میں ربٰوا کی حرمت کا حکم نازل ہوا "**اَحَلَّ اللّٰہُ البیعَ وَ حَرَّمَ الرِّبٰوا**" تو ہر عرب فرد فوراً سمجھ گیا کہ جس معاملہ کو ہم اپنی لغت میں ربٰوا کہتے ہیں اور کرتے رہتے ہیں اللہ تعالیٰ نے اس کو حرام کیا۔ اس میں انہوں نے کوئی اجمال یا ابہام محسوس نہیں کیا' لیکن مرادِ خداوندی کو وحی الٰہی سے سمجھنے والے اللہ کے رسولؐ نے جو معلّمِ قرآن اور مبیّنِ **مَااَنْزَلَ اللّٰہُ** کا مقام رکھتے ہیں' اپنے ارشادات میں ربٰوا کی اور صورتوں کا بھی ذکر فرمایا جس کو عرب ربٰوا نہیں کہتے تھے بلکہ وہ ان صورتوں کو بیوع میں شامل کرتے تھے۔ چنانچہ اور آپؐ نے ارشاد فرمایا: **اَلذَّھَبُ بِالذَّھبِ مَثلاً بِمثلٍ وَالفِضّۃ بِالفِضّۃِ مثلا بِمثلٍ الحِنطۃ بالحِنطۃِ و الشَّعیر بِالشَّعیرِ مثلاً بِمثلٍ وَالتَّمر بِالتمر مثلاً بمثلٍ و المِلحُ بِالمِلح مثلا بمثل فمن زاد او ازداد فقد اربیٰ۔ ای اتی بالربٰوا۔**
اس کو ربوا الفضل کہا جاتا ہے اور بہ اتفاقِ ائمہ یہ ربوا الفضل ان چھ چیزوں میں محصور نہیں۔ ان کے علاوہ اور بہت سی اشیاء میں بھی یہ ضروری ہے کہ ہاتھوں ہاتھ تبادلہ ہو اور

ناپ تول کے حساب سے بالکل ایک برابر ہوں۔ اگر ہاتھوں ہاتھ تبادلہ نہ ہو' یا ہاتھوں ہاتھ ہو مگر ایک طرف ہم جنس کی زیادتی ہو تو یہ ربٰوا ہوگا اور حرام ہوگا اور حَرَّمَ الرِّبٰوا میں شامل ہوگا۔ علامہ ابوبکر جصاص رازی فرماتے ہیں:

فَاَبطَلَ اللّٰہ الربا الذی کا نوا یتعا ملون بِہٖ و اَبطَلَ ضروبًا آخرمِن البیاعاتٖ وسمّا ھا ربا فانتظم قولہ تعلی وَ حَرَّمَ الرِّبٰوا تحریم جمعیھا لشمول الا سم علیھا من طریق الشرع و من ابواب الربا الشرعی السلم فی الحیوان (ج ' ۱ ص ۴۶۵) **ومن الربٰوا المراد بالآ یۃ شراء مابیاع باقل من ثمنہ قبل نقد الثمن** (ص ۴۶۶)

"یہ آیت نازل کرکے اللہ تعالیٰ نے اس ربوا کو باطل اور حرام قرار دیا جو عربوں کے ہاں عام طور پر جاری تھا لیکن ساتھ ہی (گویا احادیث کی تشریح کی رو سے) خرید و فروخت کی بہت سی صورتیں باطل قرار دیں اور ان کو بھی شرعی اصطلاح کی رُو سے ربٰوا کا نام دیا۔ تو اس صورت میں (کہ وہ بیوع بھی در حقیقت ربٰوا کی صورتیں ہیں) حَرَّمَ الرِّبٰوا کا حکم ان سب کو شامل ہوگیا کیونکہ شرعی طریقہ سے ربٰوا کا اسم ان کو بھی شامل ہے۔ چنانچہ شرعی ربٰوا میں یہ بھی داخل ہے کہ کوئی کسی جانور کو بیع سلم کے طریقے سے خریدنا چاہے اور آیت میں ذکر کردہ ربٰوا میں یہ بھی داخل ہے کہ کوئی چیز جو ادھار پر فروخت کی ہے' ابھی اس کا ثمن وصول نہیں کیا ہے کہ وہی چیز مشتری سے یہ بائع اس پہلے ثمن سے کم ثمن پر خریدے۔ (تو یہ دونوں ثمنوں میں جس قدر فرق ہے اتنی رقم ربا میں شامل ہے۔)"

امام فخرالدین رازیؒ' امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور دوسرے مفسرین و فقہاء نے لکھا ہے کہ پہلی صورت جس کو ربو النسیہ کہا جاتا ہے' ربوا حقیقی ہے۔ اور دوسری صورت میں جس کو ربو الفضل کہا جاتا ہے ربٰوا حکمی ہے۔ ربوا الفضل کی حرمت دراصل سدِ ذریعہ کے طور پر ہے' یعنی یہ وہ صورتیں ہوتی ہیں کہ اگر ان کو ممنوع قرار نہ دیا جائے اور یہ جائز ہوں تو لوگ حیلہ گری کے طور پر ان کو ربٰوا حقیقی کے لئے ذریعہ بنائیں گے اور وہ سارے مفاسد برپا ہوں گے جن کی وجہ سے ربٰوا حقیقی کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ اور اس لئے احادیثِ صحیحہ کی رُو سے مسئلہ یہ ہے کہ ان اموالِ ربویہ کے بارے میں **جَیّدُھاوَرَدِیُّھاسَوَاء** کا حکم ہے' مثلاً اگر ایک

طرف عمدہ قسم کی گندم ہے اور دوسری طرف معمولی اور ادنیٰ درجے کی' مگر تبادلہ کرتے وقت پھر بھی مساوات ضروری ہے۔ اگر ایک طرف ماپنے یا تولنے میں زیادتی ہو جائے (خواہ اس لئے کہ یہ دوسرے کے مقابلے میں کم درجے کی ہے) تو یہ زیادتی ارشادِ نبویؐ **وَالفَضلُ رِبٰوا** کے تحت ربٰوا میں شامل اور ممنوع و حرام ہوگی۔ اسی طرح سونے کا تبادلہ سونے سے ہو' چاندی کا چاندی سے ہو' تو ضروری ہے کہ وزن بالکل برابر ہو' خواہ ایک طرف بنا ہوا زیور ہو اور دوسری طرف سونے یا چاندی کے ٹکڑے ہوں۔ اگر اس لئے کہ بنا ہوا زیور اس صنعت کی وجہ سے اس لائق ہے کہ اس کے مقابلے میں سونے کی مقدار اس کے وزن سے زیادہ ہو کسی نے زیادہ سونا دیا تو وہ ربٰوا ہوگا۔ گویا باہمی تبادلہ کی صورت میں صنعت کو بھی اہمیت نہیں دی گئی اور وزن کا برابر ہونا ضروری قرار دیا۔ یہ سب کچھ محض اس لئے ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اگر اعلیٰ اور ادنیٰ ہونے یا مصنوع و غیر مصنوع ہونے کی بناء پر کمی بیشی کی اجازت دی جائے تو اسی کو ذریعہ بنا کر لوگ ربٰوا حقیقی تک نوبت پہنچا دیں گے۔۔۔ اور اسی بات کو علامہ ابن القیمؒ نے اپنی مشہور کتاب "اعلام الموقعین" (جلد ۳' ص ۱۵۵) میں یوں بیان فرمایا ہے:

ثمّ اوجب علیهم فِی التّماثُل و ان لَا یزید احد العِوَضین علی الآخَر اذا کانا مِن جنس واحد حتی لا یباع مد جید بمدّین ردیئین و اِن کانا یساویانه سدا لذریعة ربا النسأ الذی هو حقیقة الرّبٰو او انه اذا منعهم من الزیادة مع الحلول حیث تکون الزیادة فی مقابلة جودة او صفة او سکة او نحوهما فمنعهم منها حیث لا مقابل لها الا مجرد الاجل اولی فهذه حکمة تحریم ربوا الفضل التی خفیت علی کثیر من الناس حتی قال بعض المتأخرین لا یتبین لی حکمة تحریم ربوا الفضل و قد ذکر الشارع هذه الحکمة بعینها فانه حرّمه سدّا بذریعة ربا النسأ فقال فی حدیث تحریم ربا الفضل فانی اخاف علیکم الرماو الرما هو الربا فتحریم الربا نوعان نوع حرم لمافیه من المفسدة و هو ربا النسیئه و نوع حرم تحریم الوسائل و سد الذرائع فظهرت حِکمةُ الشارع الحکیم و کمال شریعته الباهرة فی تحریم النوعین

حضرات فقہائے حنفیہؒ نے بھی بطور قاعدہ کلیہ کے لکھا ہے: **الامور بمقاصدها یعنی**

ان الحکم الذی یترتبہ علی امر یکون علی مقتضی ما ھو المقصود من ذلک الامر (مجلۃ الاحکام العدلیہ مادہ ۲) "تمام امور کا دارومدار ان مقاصد پر ہوتا ہے جن کو پیش نظر رکھ کر وہ امور سرانجام دئے جاتے ہیں۔ یعنی کسی امر پر جو حکم شرعی مترتب ہوتا ہے وہ اس امر سے جو مقصود ہے اس کے مقتضٰی کے مطابق ہوتا ہے۔" اور لکھا ہے: **العبرۃ فی العقود للمقاصد و المعانی لا للالفاظ و المبانی ولذا یجری حکم الرھن فی البیع بالوفاء** (مادہ ۳) یعنی "عقود میں اصل اعتبار مقاصد و معانی کا کیا جائے گا' الفاظ و عبارات کو نہیں دیکھا جائے گا۔ اس لئے بیع بالوفا میں اگرچہ لفظ تو بیع کا استعمال ہو رہا ہے مگر دراصل مقصد رہن کا ہے' اس لئے اس پر رہن کے احکام جاری کئے جائیں گے۔" اس قاعدہ کو سمجھانے کے لئے فقہائے کرام نے چند مثالیں بھی دی ہیں۔ مثلاً ایک شخص نے دکاندار سے کوئی چیز خریدی' ثمن اس کے پاس موجود نہیں ہے' وہ چیز اپنے قبضہ میں لے کر جا رہا ہے اور اس نے اپنے ہاتھ کی گھڑی اتار کر دکاندار کو دے دی کہ یہ اپنے پاس امانت رکھو' میں ثمن لے کر آرہا ہوں۔ یہاں اگرچہ اس نے لفظ امانت یا ودیعت استعمال کیا ہے لیکن درحقیقت یہ اس نے اس واجب الادا ثمن کے بدلے گھڑی رہن رکھی ہے۔ اس گھڑی پر امانت کے احکام جاری نہیں ہوں گے بلکہ اس پر سارے احکام رہن کے جاری ہوں گے۔ دوسری مثال یہ ہے کہ زید نے عمرو سے کہا کہ میں اپنا یہ گھوڑا آپ کو ہبہ کر کے دے رہا ہوں ایک ہزار روپیہ کے بدلے میں' تو زید نے اگرچہ لفظ تو ہبہ کا استعمال کیا ہے' لیکن جب اس گھوڑے کے بدلے میں ہزار روپیہ کا بھی ذکر ہے تو یہ بیع ہے' ہبہ نہیں۔ اور اس عقد پر سارے احکام ہبہ کے متفرع نہیں ہوں گے' بلکہ بیع کے سارے احکام متفرع ہوں گے۔ اگر کوئی جائداد اس طرح ہبہ کے نام سے کسی شے کے بدلے میں دی ہے تو جائداد کی بیع ہوئی ہے' اس کا ہبہ نہیں ہوا' لہٰذا اس جائداد پر شفعہ ہو سکتا ہے۔ اسی کو فقہاء کرام کہتے ہیں: ہبہ بشرط العوض بیع ہے' ہبہ نہیں (درر الاحکام شرح مجلۃ الاحکام العدلیہ میں یہ تمام تفصیلات موجود ہیں)

ان تمام تفصیلات کو ذہن نشین کرانے کے بعد اب دیکھئے کہ حیلہ کر کے فرار عن الربا کی کیا کیا صورتیں سودی ذہن رکھنے والے ربٰوا کے مقصد کے لئے اختیار کرتے ہیں' جبکہ شارع علیہ السلام نے ان حیلوں کو باطل قرار دیا ہے۔

(۱) زید کو سو روپیہ کی ضرورت پیش ہوئی (خواہ ذاتی اخراجات کے لئے یا تجارت کرنے کے

لئے) وہ ایک سرمایہ دار تاجر کے پاس آیا کہ آپ مجھے سو روپیہ قرض دیجئے، میں چھ ماہ کے بعد واپس کردوں گا۔ تاجر سودی ذہنیت کے ساتھ سوچتا ہے کہ میں سو روپیہ اس کو قرضِ حسنہ دے کر چھ ماہ انتظار کروں تو اس کا مجھے کیا فائدہ ہوگا (اس ذہنیت کے لوگ آخرت کے اجر و ثواب کو کوئی اہمیت نہیں دیتے اور اس کو فائدہ نہیں سمجھتے۔) اب اگر وہ زید سے یہ کہے کہ اچھا سو روپیہ تو قرض دیتا ہوں لیکن تین روپیہ ماہوار شرحِ سود کے مطابق آپ مجھے ۱۱۸ روپے واپس کروگے، تو اس کا صاف مطلب یہی سمجھا جائے گا کہ یہ تاجر صرف تجارت نہیں بلکہ سودی کاروبار کرتا ہے۔ معاشرہ میں سود خوار بدنام ہیں، ان کو اچھی نگاہوں سے نہیں دیکھا جاتا، اس لئے یہ اس کو گوارا نہیں کہ اس پر یہ الزام لگے اور سود خوار کہلائے۔ مقصد تو یہ ہے کہ اس کو آج کے سو روپے کے بدلے چھ ماہ بعد کے ایک سو اٹھارہ مل جائیں، تو وہ سوچ کر اس فاسد مقصد کے لئے ایک حیلہ تلاش کرتا ہے۔ اس کے پاس ایک تھان پڑا ہوا ہے جس کی بازاری قیمت ایک سو روپیہ ہے۔ زید سے کہتا ہے کہ میں نقد روپیہ تو آپ کو نہیں دے سکتا، چھ ماہ کی میعاد پر مجھ سے ۱۱۸ روپے میں یہ خریدلو اور جاکر فروخت کرکے روپیہ سے کام چلاؤ۔ زید کو ضرورت درپیش ہے، اس کی ایک مجبوری ہے، اس لئے وہ مان جاتا ہے۔ تاجر وہ تھان ۱۱۸ روپے ثمن کے بدلے چھ ماہ کی میعاد پر زید کے ہاتھ فروخت کرتا ہے۔ جب زید وہ تھان اپنے قبضے میں لے لیتا ہے، تو تاجر اسے کہتا ہے کہ آپ کو تو سو روپیہ نقد چاہیے۔ یہ تھان جو اب آپ کا ہے سو روپے پر میرے ہاتھ فروخت کردیجئے۔ زید کو تو سو روپیہ کی ضرورت تھی، لہٰذا زید سے تاجر نے وہی تھان سو روپے کے بدلے خرید لیا۔ اور پہلے عقد کی بناء پر زید چھ ماہ بعد اسے ایک سو اٹھارہ روپیہ دے گا۔ تاجر اس حیلہ گری کی بناء پر اپنے دل کو یہ اطمینان دلا رہا ہے کہ میں نے اٹھارہ روپے سود نہیں لیا، دوسروں کو بھی یہ باور کراتا ہے کہ میں سودی کاروبار نہیں کرتا، مگر شریعتِ اسلامی کے قانون کی رُو سے اس کا یہ کاروبار ناجائز ہے۔

تمام کتبِ فقہ میں لکھا ہے کہ: **لایجوز شراء ما باع باقلّ بمّا باع قبل نقد الثمن** یعنی بائع نے جو چیز جس ثمن کے بدلے فروخت کی ہے ابھی مشتری نے ثمن ادا نہیں کیا تھا کہ وہی چیز یہ بائع اس سے کم ثمن پر پھر خرید رہا ہے تو یہ معاملہ جائز نہیں ہے اور اس کا عدمِ جواز خود حدیث سے ثابت ہے۔ ایک معتمد و مستند راوی ابو اسحاق سبیعی اپنی زوجہ عالیہ سے کہ وہ بھی

قابلِ اعتماد و استناد ثقہ راویۂ حدیث ہے' روایت کرتا ہے کہ عالیہ کہتی تھیں کہ ایک دفعہ میں کچھ دوسری عورتوں کے ساتھ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں حاضری ہوئی۔ انہوں نے ہم سے پوچھا کہ کس مقصد کے لئے میرے پاس آئی ہو۔ امّ محبہ نامی ایک امّ ولد تھی' اس نے کہا: ایک مسئلہ پوچھنے آئی ہوں' یا امّ المومنین' آپ زید بن ارقم کو تو جانتی ہیں۔ فرمایا کہ ہاں جانتی ہوں۔ وہ کہنے لگی کہ میں نے اپنی ایک جاریہ زید بن ارقم کے ہاتھ آٹھ سو درہم پر ادھار فروخت کی کہ جب اس کو بیت المال سے وظیفہ ملے گا تو ثمن ادا کرے گا۔ پھر اس نے ارادہ کیا کہ وہ اس کو فروخت کردے تو وہ میں نے اس سے چھ سو درم نقد پر خریدی ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے یہ سنا تو سخت ناراض ہوئیں اور غصہ کے ساتھ اس کی طرف رخ کرکے فرمانے لگیں: بہت برا کیا جو تو نے اس طرح اس کو فروخت کیا' اور بہت برا کیا جو تو نے اس طرح خریدا۔ میری طرف سے جاکر زید بن ارقم کو یہ پیغام پہنچادو کہ اس طرح کا لین دین کرکے اس نے اپنے حج اور جہاد کو ضائع کردیا' ہاں اگر وہ اس سے توبہ کرے۔ حضرت عائشہ نے اس قدر جوش و جذبہ کے ساتھ یہ بات کی کہ وہ عورت اور کچھ بول نہ سکی' دم بخود رہ گئی۔ کچھ دیر بعد کہنے لگی: یا ام المومنین' یہ بتایئے کہ اگر میں زید بن ارقم سے صرف اپنا رأس المال چھ سو روپیہ لوں' آٹھ سو نہ لوں تو پھر کیا ہوگا؟ تو حضرت عائشہؓ نے قرآن مجید کی یہ آیت تلاوت کی "**فَمَن جَآءَهُ مَوعِظَةٌ مِّن رَّبِّهِ فَانتَهَىٰ فَلَهُ مَا سَلَفَ**" یہ روایت بہت سی کتبِ احادیث میں منقول و مروی ہے اور صحیح روایت ہے اور اسی سے تمام فقہاءِ کرام نے استدلال کیا ہے!

امام ابوبکر جصاص رازیؒ نے احکام القرآن میں یہ واقعہ نقل کرکے لکھا ہے: **فدلت تلاوتها آية الربوا عند قولها اوأيت ان لم اخذ إلّا رأس مالي ان ذلك كان عندها من الربوا وهذه التسمية طريقها التوقيف** (احکام القرآن ' ج ۱' ص ۴۶۶)
جب اس عورت نے کہا کہ یہ بتایئے کہ اگر میں صرف اپنا رأس المال اس سے لے لوں تو پھر کیا ہوگا' تو اس پر حضرت عائشہؓ نے وہ آیت تلاوت کی جو ربٰوا کے سلسلہ میں ہے۔ تو ان کا یہ آیت تلاوت کرنا اس پر دلالت کررہا ہے کہ یہ دو سو روپیہ کی زیادتی ربٰوا میں داخل ہے۔ اور اس زیادتی کو ربٰوا قرار دینا محض اپنے ذہن اور اپنے اجتہاد سے نہیں تھا بلکہ یہ تسمیہ توقیفی ہے۔ (یعنی حضرت عائشہؓ نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ضرور یہ سنا ہوگا۔)

اور اس لئے جصاص رازیؒ نے روایت بیان کرنے سے پہلے یوں لکھا ہے: **و من الربو المراد بالآیۃ شراء ما باع باقل من ثمنہ قبل نقد الثمن** تمام شارحینِ حدیث نے لکھا ہے کہ حضرت عائشہؓ' زید بن ارقم رضی اللہ عنہ کے بارے میں اتنے سخت الفاظ کہ **ابطل حجہ و جہادہ مع رسولِ اللہ** محض اپنے اجتہاد سے ایک اجتہادی مسئلہ میں زبان سے نکال نہیں سکتی تھیں' یقیناً اس بارے میں انہوں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی ممانعت شدید الفاظ میں سنی ہوگی۔

اس روایت کے بارے میں یہ بھی دیکھا جائے کہ یہ اس عورت امّ محبہ کا مستقل کاروبار نہ تھا۔ زید بن ارقمؓ نے پہلے آٹھ سو روپیہ پر جاریہ خریدی تھی اور اس کی خریداری مقصود تھی۔ امّ محبہ کے ذہن میں فروخت کرتے وقت یہ نہیں تھا کہ میں اس کو پھر چھ سو روپیہ پر واپس خریدوں گی۔ چند دونوں بعد غالباً زید بن ارقمؓ کو نقد رقم کی ضرورت پڑی تو فروخت کرنے کا ارادہ کیا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ واقعہ نرخ گر گیا ہو' اس لئے وہ چھ سو پر روپیہ فروخت کرنے کے لئے تیار ہوگئے۔ امّ محبہ نے دیکھا کہ اور کوئی جو خریدے گا تو میں ہی خرید لوں۔ الغرض ان دونوں کے سامنے کوئی حیلہ نہیں تھا۔ لیکن چونکہ اس واقعہ کی نوعیت ایسی تھی کہ اگر اس طرح خریدنے اور زیادہ رقم مل جانے کو جائز قرار دیا جاتا تو اس کو دلیل جواز بنا کر سودی کاروبار کرنے والے بطورِ حیلہ کے اس قسم کی خرید و فروخت کا سلسلہ جاری رکھ سکتے تھے' اور سود کے لئے ایک چور دروازہ کھل جاتا۔ اس لئے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو پہلے سے بند فرمایا۔ جیسا کہ ربوا الفضل کی بہت سی بظاہر بے ضرر صورتیں ایسی ہیں کہ **سَدًّا لِلذّریعۃ** ان کو ربوا قرار دیا تھا اور حضرت عائشہ صدیقہؓ نے بھی آپ کے ارشاد کے مطابق اس واقعہ پر شدید نکیر فرمائی۔ زید بن ارقمؓ صحابی کو شاید اس کا علم نہ تھا کہ یہ صورت بھی **سَدًّا لِلذّریعۃ** جناب رسول اللہؐ نے ممنوع قرار دی ہے' ورنہ وہ کبھی یہ کام نہ کرتے۔ امّ محبہ کو بھی شاید جناب رسول اللہ کی صریح ممانعت کا علم نہ تھا ورنہ وہ بھی یہ معاملہ کبھی نہ کرتیں۔ لیکن یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ اپنے ایمانی ذوق کی بناء پر ان کے دل میں کچھ کھٹک ضرور تھی' اس لئے وہ حضرت عائشہؓ کے پاس مسئلہ پوچھنے آئی تھیں اور سارا واقعہ بیان کرکے معلوم کرنا چاہا کہ میں نے یہ صحیح کیا یا غلط؟ اور جب جواب مل گیا تو اس پر بلا حیل و حجت آمادہ ہوئیں کہ زید بن ارقمؓ سے صرف چھ سو روپیہ واپس لوں گی' آٹھ سو نہیں لوں گی۔

(۲) اس سے ملتی جلتی ایک اور صورت ہے جس کو بیع عینہ کہا جاتا ہے۔ آپ پہلی صورت ذہن میں تازہ کیجئے۔ تاجر نے سود کے الزام سے بچنے کے لئے سو روپیہ کا تھان ۱۱۸ روپے پر ادھار دیا۔ زید نے وہ تھان بازار میں جا کر کسی کو بازاری قیمت سو روپیہ پر فروخت کر دیا۔ اس خریدار نے آکر وہ تھان پھر اس تاجر کو سو روپے کے بدلے فروخت کر دیا۔ تاجر کے ہاں سے سو روپے گئے مگر چھ ماہ بعد ۱۱۸ زید سے لے گا۔ یہ زائد اٹھارہ روپے ادھار کی وجہ سے اس کو زائد مل گئے۔ دوسری صورت میں براہِ راست زید سے تاجر نے تھان نہیں خریدا' تاکہ اس پہلی صورت میں شامل نہ ہو جو حدیث کی بناء پر تمام فقہاءِ کرام کے ہاں ناجائز ہے۔ یہاں مزید حیلہ یہ کیا کہ درمیان میں ایک اور خریدار کو ڈال دیا تاکہ یہ نہ کہا جاسکے کہ تاجر نے زید سے کم ثمن پر خریدا' بلکہ اس نے تو تیسرے شخص سے خریدا ہے۔ کم قیمت پر خریداری تو اس تیسرے شخص نے کی ہے۔

اس بیع عینہ کے بارے میں بھی ممانعت کی حدیثیں موجود ہیں۔ مسند امام احمدؒ اور سنن ابی داوٗدؒ میں قابلِ اعتماد ثقہ راویوں کی سند سے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی علیہ وسلم سے سنا کہ فرماتے تھے:

> **اِذَا ضَنَّ النَّاسُ بِالدِّينَارِ وَالدِّرْهَمِ وَ تَبَايَعُوا بِالْعِينَةِ وَ اتَّبَعُوا اَذْنَابَ الْبَقَرِ وَتَرَكُوا الْجِهَادَ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ بَلَاءً فَلَا يَرْفَعُهُ حَتّٰى يُرَاجِعُوا دِينَهُمْ** (اور ایک روایت میں یوں ہے **حَتّٰى يَتُوبُوا اَوْ يُرَاجِعُوا دِينَهُمْ**)
> یعنی جب لوگوں کی حالت یہ ہو جائے کہ دینار و درھم کے بارے میں بخل کرنے لگ جائیں (قرضِ حسنہ دینے پر آمادہ نہ ہوں) اور نفع اندوزی کے خیال سے آپس میں بیع عینہ کرنے لگ جائیں' جہاد فی سبیل اللہ چھوڑ کر بیلوں کی دموں کے پیچھے لگ جائیں' صرف زراعت پر قانع ہو کر بیٹھ جائیں تو اس ناجائز لین دین کرنے اور جہاد فی سبیل اللہ ترک کرنے کی سزا میں اللہ تعالیٰ ان پر ایک عظیم بلا نازل فرمائے گا اور جب تک وہ توبہ کر کے اصل دین کی طرف رجوع نہ کریں وہ بلا ان سے ٹلے گی نہیں۔ مصیبتوں میں مبتلا رہیں گے۔

اس ارشادِ نبویؐ کے اندازِ بیان اور سیاق و سباق سے یہی معلوم ہوتا ہے اور تمام شارحینِ حدیث اور فقہاء نے یہی سمجھا ہے کہ بیع عینہ کو ایک ناجائز عقد قرار دیا گیا ہے۔ حضرت انسؓ

سے عینہ کے بارے میں پوچھا گیا کہ اس کا حکم کیا ہے تو آپؓ نے فرمایا: **اِنَّ اللّٰہَ لَا یُخدَعُ ھٰذَا مِمَّا حَرَّمَ اللّٰہُ وَرَسُولُہٗ**۔ اور اسی طرح حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا ہے: **اتقوا ھذہ العینۃ لا تبع دراھم بدراھم و بینھما حریرۃ**۔ اور ایک روایت میں واقعہ لکھا ہے کہ ایک شخص نے ریشمی کپڑا سو درم کے بدلے میں فروخت کیا۔ پھر اس سے پچاس روپے میں خریدا، پھر حضرت ابن عباسؓ سے اس بارے میں مسئلہ پوچھا تو آپ نے فرمایا: **دراھم بدراھم متفاضلۃ دخلت بینھما حریرۃ**۔ یعنی یہ تو دراہم کا دراہم کے ساتھ ایسا تبادلہ ہوا ہے کہ ایک طرف زائد ہے یعنی سو روپیہ ہے اور دوسری طرف کم ہے یعنی پچاس روپیہ ہے تو ربٰوا ہو گیا' یہ ریشمی کپڑا ویسے ہی درمیان میں کر لیا گیا۔ دوسری روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے بیع عینہ کے بارے میں کسی نے پوچھا تو فرمایا: **ان اللّٰہ لا یخدع ھذا مِمّا حرم اللّٰہ و رسولہ**۔ "اللہ کو تو دھوکہ نہیں دیا جا سکتا کہ اس حیلے سے حرام کو حلال کیا جائے' یہ وہ معاملہ ہے جس کو اللہ اور اس کے رسولؐ نے حرام قرار دیا ہے" امام اوزاعی نے حدیثِ مرسل کے طور پر فرمایا ہے کہ: **قال رسولُ اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ و سلم یَاْتِی عَلَی النَّاسِ زَمَانٌ یَستَحِلّونَ الرِّبَا بِالبَیعِ یَعنِی العِینَۃ**۔ "جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ایسا زمانہ آئے گا کہ لوگ سود کا تجارت نام رکھ کر اس کو حلال قرار دیں گے" آپؐ کی مراد اس سے بیعِ عینہ کا یہ طریقہ ہے جو سود خواری کے لئے ذریعہ بنایا جا رہا ہے (اعلام الموقعین' ج ۳' ص ۱۶۶) حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمتہ اللہ کا قول بھی منقول ہے کہ عینہ کے بارے میں وہ فرمایا کرتے تھے: **ھو اخیۃ الربا** "یہ درحقیقت ربا کے لئے کھونٹا ہے۔" علامہ ابن القیمؒ نے اپنے استاد علامہ ابن تیمیہؒ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ وہ اس کو جائز نہیں کہتے تھے۔ میرے سامنے جب کبھی کوئی اس بارے میں سوال کرتا تو جواز کا حکم نہ دیتے اور فرماتے: **المعنی الذی لاجلہ حرّم الربٰوا موجود فیھا بعینہ مع زیادۃ الکلفۃ بشراء السلعۃ و بیعھا و الخسارۃ فیھا فللشریعۃ لا تحرّم الضرر الا دنٰی و تبیح ما ھو اعلیٰ منہ** (اعلام الموقعین' ج ۳' ص ۱۷۰) "جس وجہ سے ربٰوا کو حرام کیا گیا وہ اس بیعِ عینہ کی صورت میں موجود ہے۔ بلکہ اس میں خواہ مخواہ مزید ایک تکلیف اٹھانی پڑتی ہے کہ کوئی چیز خریدی پھر وہی چیز فروخت کر دی اس میں نقصان برداشت کر کے' تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ شریعت ادنیٰ ضرر کو تو حرام قرار دے اور جو اس سے بڑھ کر ضرر ہو اس کو جائز کر دے کہ اس

میں کوئی حرج نہیں ہے۔"

امام ابوبکر جصاص رازیؒ نے نقل کیا ہے کہ حضرت سعید بن المسیب رحمتہ اللہ علیہ سے حکیم بن زریق نے پوچھا کہ ایک شخص نے کچھ غلہ دوسرے کو ادھار پر فروخت کیا۔ جس نے غلہ خریدا تھا اس نے ارادہ کیا کہ اس کو فروخت کروں تو پہلے بائع نے اس سے نقد پر خرید لیا تو حضرت سعید نے فرمایا: **ھو ربا** "یہ تو سود ہے" اور لکھا ہے کہ ابن عباسؓ' قاسم بن محمد ؒ' مجاہدؒ' ابراہیمؒ' شعبیؒ' حسن بصریؒ اور محمد بن سیرینؒ یہ سب اس معاملہ کو منع کرتے ہیں (احکام القرآن جلد نمبر ا' ص ۴۶۶)

یہاں بیع عینہ کی دو صورتیں ذکر کی گئی ہیں' ایک میں تاجر ادھار مہنگا فروخت کر کے اس خریدار سے کم قیمت پر نقد لینا ہے۔ یہ وہی **شراء ما باع باقل مما باع قبل نقد الثمن** کی صورت ہو گئی۔ دوسری صورت میں خریدار اس چیز کو کسی اور کے ہاتھ نقد کم قیمت پر فروخت کرتا ہے اور یہ تاجر اس تیسرے شخص سے اسی کم قیمت پر نقد خرید تا ہے اور اس طرح وہی چیز اس کے پاس واپس آجاتی ہے۔ اور اس خریدار پر قیمت سے زائد رقم محض اس لئے آجاتی ہے کہ وہ ادھار خرید رہا ہے۔ مگر صاحبِ ہدایہ علامہ مرغینانیؒ نے بیع عینہ کی جو صورت لکھی ہے اس میں قرض مانگنے والا وہ چیز بازاری قیمت سے زیادہ ثمن پر خرید تا ہے تاکہ اس کو بازار میں کسی کے ہاتھ اس وقت کے عام بازاری بھاؤ پر جو یقیناً کم ہوتا ہے فروخت کردے گا اور نقد رقم جو اس کو مطلوب ہے اس وقت اس کے ہاتھ آجائے' خواہ بعد میں وہ اس سے زائد رقم جو بطور ثمن طے شدہ ہے تاجر کو ادا کرے گا اور یہ زیادتی وہ اس لئے گوارا کر رہا ہے کہ اس کو میعاد مل رہی ہے۔ اس بائع تاجر کے پاس اس چیز کا پھر لوٹ کر آنا صاحبِ ہدایہ کے ہاں بیع عینہ کی تعریف میں شامل نہیں ہے۔ اور اس بیع عینہ کے بارے میں صاحبِ ہدایہ لکھتے ہیں:

وھو مکروہ لما فیہ من الاعراض عن مبرۃ الا قراض مطاوعۃ لمذموم البخل (ہدایہ، جلد ۳' باب الکفالہ) "بیع کی یہ صورت اس لئے مکروہ ہے کہ اس میں کسی کو قرض دینے کی نیکی سے پہلو تہی کر کے بخل کی مذموم خصلت کے تقاضے کو پورا کیا گیا ہے" اس پر عنایہ شرح ہدایہ میں لکھا ہے:

و سمّی ھذا البیع عینۃ لِمَا فیہ مِن الاعراض عَن الثّمن الی العین و ھو مکروہ لِاَنّ فیہ الاعراض عَن مبرۃِ الاقراض مُطاوَعَۃَ البخل الذی ھو

مذموم و کان الکرہ حصل من الجموع فان الا عراض عن الاقراض لیس بمکروہ والبخل الحاصل من طلب الربح فی التجارات کذلک و الا لکانت المرابحۃ مکروھۃ (علی ہامش فتح القدیر' ج ۶' ص ۳۲۳)

"اس بیع کا بیع عینہ اس لئے نام رکھا گیا کہ اس میں دَین (نقد رقم قرض کے طور پر دینے کی بجائے) عین (یعنی کسی متعین چیز کو فروخت کرنے) کی طرف منہ موڑا ہے۔ اور یہ بات کہ وہ تو نقد رقم قرض مانگنے آیا تھا' اس نے قرض دینے کی نیکی سے پہلو تہی کی اور اس بخل کے تقاضے کے مطابق مہنگی چیز فروخت کردی جو ایک مذموم خصلت ہے۔ اور اس کا مکروہ ہونا ان دونوں باتوں کے مجموعہ سے ثابت ہوا۔ ورنہ صرف اتنی بات کہ کوئی قرض نہ دے مکروہ نہیں۔ اور تجارت میں فائدہ حاصل کرنا بھی مکروہ نہیں ورنہ مرابحہ مکروہ ہوتا"

اس نے یہاں قرض دینے سے یوں انکار کیا کہ اس کی بجائے نفع حاصل کرنے کے لئے مہنگی چیز فروخت کردی اور زائد رقم وصول کرنے کی صورت سوچی۔ اور ہدایہ کی دوسری شرح کفایہ میں بیع عینہ کی صورت تو وہی لکھی ہے جو پہلے میں نے بیان کی تھی کہ چیز واپس تاجر کے پاس آجاتی ہے۔ اور پھر لکھا ہے:

وبیع العینۃ مکروہ ذمیم اخترعہ اکلۃ الربٰوا و قد ذمّہم رسولُ اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم بِذٰلک فقال اِذا تَبایَعتُم بِالعِینۃ الخ و قیل ایاک و العینۃ فانھا لَعِینَۃ (کفایہ علی ہامش فتح القدیر' ج ۶' ص ۳۲۳)

"بیع عینہ مکروہ ہے' قابلِ مذمت ہے۔ دراصل سود خوار لوگوں نے سود خوری کے لئے یہ طریقہ ایجاد کیا ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے لوگوں کی مذمت بیان فرمائی ہے کہ جب تم لوگ بیع عینہ کرنے لگ جاؤ گے اور اس کے بارے میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ بیع عینہ کرنے سے بچا کرو' اس پر لعنت کی گئی ہے"

اور عینہ کے بارے میں یہی الفاظ عنایہ میں بھی ہیں۔ محقق ابن الہمامؒ نے فتح القدیر میں امام محمدؒ کا یہ قول نقل کیا ہے:

ھذا البیع فی قلبی کالمثل الجبل ذمیم اخترعہ اکلۃ الربٰوا و قد ذمّہم رسولُ اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال اذا تبایعتم العینۃ (فتح القدیر' ج ۶'

ص ۳۲۴)

"اس بیع عینہ کے بارے میں میرے دل کے اندر بڑے بڑے پہاڑوں جیسی کراہت ہے۔ یہ قابلِ مذمت عمل ہے' دراصل سود خوروں نے سود خوری کے لئے یہ طریقہ ایجاد کیا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے لوگوں کی مذمت فرمائی ہے فرمایا: اذا تبایعتم بالعینۃ الخ"۔

الدرالمختار میں ہے: **بیع العینۃ بیع العین بالربح نسیئۃ لیبیعھا المستقرض بالقلیقضی دینہ اخترعہ اکلۃ الربوا و ھو مکروہ مذموم شرعا لما فیہ من الاعراض عن مبرۃ الاقراض**۔ اور اس پر علامہ شامیؒ نے لکھا ہے: **وھو مکروہ ای عند محمد وبہ جزم فی الھدایہ**۔ اس کے بعد فتح القدیر کی ایک طویل عبارت نقل کی ہے۔ (شامی' جلد ۴' ص ۳۸۷) عالمگیری ج ۲' ص ۲۱۲' میں بھی مبسوط کے سوائے بیع عینہ کی وہی صورت ذکر کی ہے جو صاحب ہدایہ نے ذکر کی ہے۔

علامہ قرطبی نے اپنی تفسیر میں **سد الذرائع** کے طور پر بہت سی ایسی صورتوں کے ممنوع ہونے کا ذکر کیا ہے جو ربا کے لئے حیلہ بن سکتی ہیں۔ اور لکھا ہے کہ شریعت نے سدِ ذریعہ کے طور پر حرام سے بچنے کے لئے بہت سے ایسے امور کو منع کیا ہے' جو دیکھا جائے تو فی نفسہٖ عام حالات میں وہ مباح ہیں اور پھر لکھا ہے۔

والربا احق ما حمیت مراتعہ و سدت طرائقہ و من اباح ھذہ الاسباب فلیبح حفر البئر و نصب الحبالات لھلاک المسلمین و المسلمات و ذلک لا یقولہ احد۔

"جن جن معاملات کی چراگاہوں کو محفوظ کرنے کی خاطر ان کے قریب بھی کسی کو پھٹکنے نہیں دیا جاتا تاکہ چراہ گاہ میں اندر جا کر نہ چر سکے ان میں سب سے زیادہ محفوظ رکھنے کا حق دار یہ ربا کا معاملہ ہے۔ اور یہ کہ اس کی طرف جانے والے تمام راستے دُور ہی سے بند کئے جائیں اور جو لوگ ان اسباب کو جو ربا کا ذریعہ بن سکتے ہیں مباح قرار دیتے ہیں تو ان کو چاہیے کہ مسلمان مردوں اور عورتوں کو ہلاک کرنے کے لئے راستوں میں کنواں کھودنے اور جال پھیلانے کو بھی امرِ مباح قرار دیں۔ لیکن اس کے جواز کا کوئی بھی قائل نہیں ہے"

علامہ قرطبیؒ اس کے بعد تحریر فرماتے ہیں:

وایضًا فقد اتفقنا علی منع من باع بالعینۃ اذا عرف بذلک و کانت عادتہ و ھی فی معنی ھذا الباب واللّٰہ الموفق للصواب

"اور یہ بھی ہے کہ ہم اس پر متفق ہو گئے ہیں کہ جو شخص بیع عینہ کا کاروبار کرنے میں مشہور ہو اور یہ اس کی عادت ہو اس کے لئے یہ بیع بالکل ممنوع ہے اور وہ بھی اسی وجہ سے ہے کہ یہ ربٰوا کے لئے بطور ایک حیلہ کے اختیار کیا جا رہا ہے۔"

اور اس کے بعد علامہ نے بیع عینہ کی صورتیں نقل کر کے اس کے ممنوع اور ناجائز ہونے کا مسئلہ بیان کیا ہے (تفسیر قرطبی' ج ۳'ص ۳۶۰)

ایک مسئلہ تمام فقہاءِ کرام کے ہاں بالاتفاق ہے کہ سونے کا تبادلہ اگر سونے کے ساتھ ہو تو مشہور حدیث "**الذّھب بالذّھب یدًا بید و الفضلُ ربٰوا**" کی بناء پر ہاتھوں ہاتھ ہونا اور دونوں طرف وزن کا برابر ہونا ضروری ہے۔ حتیٰ کی مثلاً دو تولہ سونے کا بنا ہوا ایک زیور ہے جس کے سنار سے بنوانے کی اجرت مثلاً ۳ ماشہ ہو سکتی ہے' تو اگر دو شخص کسی وقت اس زیور کا سونے سے تبادلہ کر رہے ہوں تو اس کے بدلے میں سونا دو تولہ ہی ہونا چاہیے۔ اگر سونے کے ٹکڑے اس بنے ہوئے زیور کے بدلے میں دو تولہ ۳ ماشہ دیئے اور لئے تو یہ ۳ ماشہ ربٰوا اور حرام سونا ہو گا۔ حالانکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ آخر اس کاریگری اور محنت کا بھی تو معاوضہ اس زیور والے کو ملنا چاہیے' مگر اس حدیث اور آپؐ کے ارشاد "**جَیِّدُھا و رَدِیّھا سَوَاء**" کی بناء پر بنا ہوا زیور اور سونے کے ٹکڑے برابر وزن کے ہونے چاہئیں اور یہ حرمت اس لئے ہے تاکہ اگر ایسی صورتوں میں ایک طرف وزن و کیل کی زیادتی کو جائز قرار دیا جائے تو اس جواز کے پردے میں آگے جا کر لوگ ایسی ایسی صورتیں نکالیں گے جو حقیقی ربٰوا کے لئے بطور حیلہ کام میں لائی جائیں گی۔ تو "**سدًّا للذّریعۃ**" اس فرق کو غیر معتبر قرار دے کر بہر حال مساوات ضروری قرار دی گئی' اور حیلہ گری کے تمام راستے بند کر دیئے گئے۔ اور یہی مسئلہ اعلیٰ قسم کی گندم اور ادنیٰ قسم کی گندم' اعلیٰ قسم کے چاول اور ادنیٰ قسم کے چاول اور دوسرے اجناس کے بارے میں بھی ہے۔ اس سے شریعت کے اصل مزاج کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ سود خواری کے دروازوں کو تو کیا چھوٹی چھوٹی کھڑکیوں اور روشن دانوں کو بھی بند کرنا چاہتی ہے تاکہ کوئی ہوا خوری کے بہانے اندر جانے کا راستہ تلاش نہ کر لے۔

سود خواری کے لئے حیلوں کو ممنوع قرار دینے کی ایک مثال اور لیجئے۔ فقہاءِ کرام کے ہاں ایک اصطلاح ہے بیع بالوفاء اس کی صورت یہ ہے کہ مثلاً زید ایک مکان کا مالک ہے جس کی بازاری قیمت ایک لاکھ ہے۔ زید کو پچاس ہزار روپیہ کی ضرورت پڑی' اس کو کہیں سے قرضِ حسنہ نہیں مل سکا' اپنے اس مکان کو وہ مستقل فروخت بھی نہیں کرنا چاہتا' وہ اس کے لئے ایک بڑے دولت مند خالد کے پاس آیا' اور یہ خواہش کی کہ میرا مکان رہن رکھ کر مجھے پچاس ہزار دے دو۔ خالد یہ سوچتا ہے کہ مکان صرف اعتماد کے لئے رہن رکھوں تو پچاس ہزار روپیہ دینے کا مجھے کیا فائدہ ہوا۔ اور اگر مکان قبضہ میں کر کے دو سو روپیہ ماہوار کرایہ پر کسی کو دے کر کرایہ لے لیا کروں تو لوگ کہیں گے کہ قرضہ دے کر اس کا ماہوار سود لے رہا ہے' کیونکہ مرہون شے سے فائدہ حاصل کرنا تو سود ہے۔ اس لئے وہ کہتا ہے کہ بھائی رہن نہیں رکھتا' آپ اپنا مکان پچاس ہزار روپیہ میں میرے نام فروخت کردیں اور میں یہ وعدہ کرتا ہوں کہ جب بھی پچاس ہزار روپیہ مجھے لا کر دو گے تو میں مکان پھر آپ کو واپس کردوں گا۔ یعنی دراصل دونوں کی نیت وہی ہے ورنہ زید ایک لاکھ کا مکان پچاس ہزار پر کیوں فروخت کرتا۔ اور اس شرط لگانے اور وعدہ کرنے کی کیا ضرورت کہ رقم لے آؤ گے تو مکان پھر دیدوں گا۔ گرچہ الفاظ میں تو یہ بیع و شراء ہے مگر در حقیقت وہی بات ہے جو زید اپنے ذہن میں طے کر کے آیا تھا۔ کچھ لوگوں نے بیع کے نام ہی کو جواز کا حیلہ بنایا' اور بیع بالوفاء کو جائز قرار دیا' لیکن تحقیق فقہاءِ کرام نے تصریح کی کہ یہ بیع نہیں بلکہ رہن ہے اور ایسے مکان کا کرایہ خالد جو لے رہا ہے وہ سود ہی ہے۔ الدرّ المختار میں ہے: **قیل ھو رھن** یعنی بیع بالوفا رہن ہے۔ اس پر علامہ شامیؒ نے ردّ المحتار میں مفصّل حاشیہ لکھا ہے:

قدّمنا انفا عن جواھر الفتاوٰی انہ الصحیح قال فی الخیریۃ و الذی علیہ الاکثر انہ رھن لا یفترق عن الرھن فی حکم من الاحکام قال السید الامام قلت للامام الحسن الماتریدی قد نشاھذا البیع بین الناس و فیہ مفسدۃ عظیمۃ و فتواک انہ رھن و انا ایضاً علی ذلک فالصّواب ان تجمع الائمۃ و تتفق علی ھذا و نظھرہ بین الناس فقال المعتبر الیوم فتوانا و قد ظھر ذلک بین الناس فمن خالفنا فلیبرز نفسہ و لیقم دلیلہ اھ قلت و بہ صدر فی جامع الفصولین فقال رامز الفتاوی النسفی البیع الذی تعارفہ اھل زماننا احتیالاً للربا و سمّوہ بیع الوفاء ھو رھن فی

الحقیقۃ لا یملکہ و لا ینتفع بہ اِلّا باذن مالکہ و ھو ضامن لما اکل من ثمرہ و اتلف من شجرہ و لیسقط الدین بھلا کہ لو بقی و لا یضمن الزیادۃ و للبائع استردادہ اذا قضی دَینہ لا فرق عندنا بینہ و بین الرھن فی حکم من الاحکام اھ ثم نقل مامرّ عن السیّد الامام و فی جامع الفصولین و لو بیع کرم بجنب ھذا الکرم فالشفعۃ للبائع لا للمشتری لِأَن بیع المراسلۃ و بیع التلجئۃ حکمھا حکم الرھن و للراھن حق الشفعۃ و ان کان فی ید المرتھن اھ (شامی' ج ۴' ص ۲۴۱-۲۴۲)

'ہم اس سے پہلے جواہر الفتاوی سے نقل کر چکے ہیں کہ بیع بالوفا در حقیقت رہن ہے اور یہی قول صحیح ہے۔ علامہ خیر الدین رملیؒ نے فتاوٰی خیریہ میں لکھا ہے: اکثر علماء کا فیصلہ یہ ہے کہ یہ بیع بالوفاء رہن ہے اور کسی حکم میں بھی وہ رہن کے احکام سے مختلف نہیں۔ السید الامام نے فرمایا ہے کہ میں نے امام حسن الماتریدیؒ سے کہا کہ یہ بیع بالوفاء عام طور پر لوگوں میں رائج ہو چکا ہے اور اس میں عظیم مفاسد اور خرابیاں ہیں اور آپ کا فتویٰ بھی یہ ہے کہ یہ بیع نہیں رہن ہے اور میرا بھی یہی نظریہ اور فتویٰ ہے' تو بہتر یہ ہے کہ تمام علماءِ کرام جو رہنمائی اور پیشوائی کا مقام رکھتے ہیں' جمع ہوں اور سب اس پر اتفاق کریں کہ یہ رہن ہے اور ہم تمام لوگوں کو یہ مسئلہ ظاہر کریں۔ تو انہوں نے جواب میں فرمایا کہ آج کے دور میں ہمارا فتویٰ معتبر اور قابل اعتماد ہے اور تمام لوگوں کے ہاں یہ بات ظاہر ہو گئی ہے کہ ہم اس کو رہن قرار دیتے ہیں۔ تو جو کوئی ہماری اس رائے کا مخالف ہو تو وہ اپنے آپ کو ظاہر کر دے اور اس کے خلاف اس کو بیع قرار دینے پر دلیل قائم کرے علامہ شامیؒ فرماتے ہیں کہ) میں کہتا ہوں کہ جامع الفصولین میں بھی فتاوی النسفیؒ کے حوالے سے لکھا ہے کہ وہ بیع جو ہمارے زمانے میں اہلِ زمانہ کے ہاں رائج ہوئی ہے اور یہ دراصل ربٰوا کے لئے ایک حیلہ ہے اور اس کا نام بیع بالوفاء رکھا ہے' حقیقت میں وہ رہن ہے۔ اس سے وہ خریدار کہلانے والا نہ اس چیز کا مالک بنتا ہے نہ اس سے اذنِ مالک کے بغیر نفع حاصل کر سکتا ہے۔ اور اگر وہ باغ ہے اور یہ اس کا پھل کھائے یا اس درخت کو تلف کرے تو اس کو اس کا تاوان دینا پڑے گا۔ اور اگر وہ اس کے قبضے میں ہلاک ہو جائے تو اس کا دَین ساقط ہو جائے گا

اگر وہ باقی ہو۔ اور اگر اس میں کچھ اضافہ ہو جائے تو بعد میں اس کا ضمان بائع سے نہیں لے گا۔ اور بائع جب وہ دَین واپس لا کر دے تو اس کو واپس لوٹانے کا حق حاصل ہے۔ ہمارے ہاں اس میں اور رہن میں حکم کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں۔ پھر انہوں نے السید الامام کا وہ واقعہ نقل کیا ہے جو ہم نے پہلے ذکر کیا ہے۔ اور جامع الفصولین میں یہ بھی لکھا ہے کہ اگر اس باغ کے پڑوس میں کوئی دوسرا باغ فروخت ہوا تو اس پر شفعہ کا حق اس بائع کو ہے مشتری کو نہیں' کیونکہ بیع معاملہ (بیع بالوفاء) اور بیع تلجئہ دونوں کا حکم رہن کا حکم ہے۔ اور راہن کے لئے حقِ شفعہ ہوتا ہے اگرچہ اس مرہون شے پر قبضہ مرتہن کا ہو۔"

مجلّۃ الاحکام العدلیہ میں مادہ ۳ ہے:

العبرۃ فی العقود للمقاصد و المعانی لا للالفاظ و المبانی و لذا یجری حکم الرّھن فی البیع بالوفاء

اور اس کی شرح میں درر الحکام میں بڑی تفصیل کے ساتھ بحث کر کے لکھا ہے

بیع الوفاء فاستعمال کلمۃ البیع فیہ التی تتضمن تملیک المبیع للمشتری اثناء العقد لا یفید التملیک لانہ لم یکن مقصودًا من الفریقین بل المقصود بہ انما ھو تامین دَین المشتری المترتب فی ذمۃ البائع و ابقاء المبیع تحت ید المشتری لِحین وفاء الدَین و لذٰلک لَمْ یخرج العقد عن کونہ عقد رھن فیجری بہ حکم الرھن و لا یجری حکم البیع (ج ۱' ص ۱۸-۱۹)

عقود (باہمی معاملات) میں اصل اعتبار ان کے مقاصد اور معانی کو ہے صرف الفاظ اور معانی کو نہیں ہے اور یہی وجہ ہے کہ بیع بالوفاء کی صورت میں اس پر رہن کا حکم جاری ہو گا بیع کا نہیں۔ درر الاحکام میں اس کی مزید تشریح کی ہے کہ بیع الوفاء ایک ایسا عقد ہے کہ اس میں بیع کا لفظ استعمال کیا جا رہا ہے جو دراصل تملیکِ بیع کے لئے ہوتا ہے کہ اس کے ذریعے مشتری مالک بن جاتا ہے۔ لیکن یہاں اس سے تملیک کا فائدہ حاصل نہیں ہوتا کیونکہ دونوں فریق کا اصل مقصود اس میں تملیکِ شے ہے ہی نہیں۔ دونوں کا مقصود صرف یہ ہے کہ بائع کے ذمہ اس مشتری کا جو دَین لازم آیا ہے اس دَین کے بارے میں اطمینان حاصل ہو' اور دَین

کے ادا کرنے کے وقت تک یہ مبیع مشتری کے قبضے میں رہے۔ اور چونکہ اصل مقصد یہ ہے اس لئے محض لفظاً بیع کہہ دینے سے یہ عقد رہن سے نہیں نکلتا تو اس پر رہن کا حکم جاری ہو گا، بیع کا حکم جاری نہیں ہو گا۔

مسئلہ کو واضح کرنے کے لئے یہ چند مثالیں ذکر کی گئیں جن کو فقہاءِ کرام نے ممنوع قرار دیا ہے۔ اور اس بناء پر کہ اگرچہ ان میں بظاہر بیع کی صورت ہے، فریقین آپس میں راضی ہو کر یہ عقد کرتے ہیں، مگر ایک فریق کی مجبوری ہوتی ہے حقیقی رضامندی نہیں ہوتی۔ اور نیت بھی اس میں وہ ہوتی ہے جو نیت سود لینے والے کی ہوتی ہے۔ اور ان معاملات میں سودی ذہنیت کی پرورش ہوتی ہے اور یہ معاملات سود کے لئے بطور ایک حیلہ کے اختیار کئے جاتے ہیں، تاکہ بظاہر ربوا حقیقی کے جرم کا ارتکاب نہ ہو اور مقصد وہی ہوتا ہے جو ربٰوا کا ہے۔ اور اس سے معاشرہ میں وہ سارے مفاسد پیدا ہوتے ہیں جو سودی کاروبار سے پیدا ہوا کرتے ہیں۔ تو ان مثالوں کی طرح یہ بھی ہے کہ ادھار کی وجہ سے کسی چیز کی قیمتِ فروخت اس کی بازاری قیمت سے بڑھائی جاتی ہے اور عموماً یہ اضافہ میعاد کے کم و بیش کے تناسب سے کم و بیش ہوتا ہے۔ مثلاً اگر یہ مہینہ کا ادھار ہے تو دو روپے کا اضافہ کیا جاتا ہے اور چار مہینہ کا ادھار ہے تو آٹھ روپیہ کا اضافہ کیا جاتا ہے، یعنی میعاد ہی پر اضافے کا دارومدار ہوتا ہے تو یقیناً یہ اضافہ اجل (میعاد) کی وجہ سے ہوتا ہے۔

احادیثِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، آثارِ صحابہ کرامؓ اور اقوالِ فقہاءِ امت سے یہ بھی ثابت ہے کہ جہاں ربٰوا کا شبہ ہو اس سے بھی بچنا چاہیے۔ مشہور حدیث ہے: **اَلحَلَالُ بَیّنٌ وَ الحَرَامُ بَیّنٌ وَ بَینَھُمَا مُشتَبِہَاتٌ فَمَنِ اتّقَی الشُّبہَاتِ فَقَدِ استَبرَأَ لِدِینِہٖ وَ عِرضِہٖ وَ مَن وَقَعَ فِی الشُّبہَاتِ وَقَعَ فِی الحَرَامِ کَالرَّاعِی یَرعیٰ حَولَ الحِمیٰ یُوشِکُ اَن یَرتَعَ فِیہِ۔** اور فرمایا: **دَع مَا یُرِیبُکَ اِلیٰ مَا لَا یُرِیبُکَ۔** اور فرمایا: **اَلاِثمُ مَا حَاکَ فِی صَدرِکَ وَ تَرَدَّدَت فِیہِ النَّفسُ وَ کَرِھتَ اَن یَطّلِعَ عَلَیہِ النَّاسُ۔ اِستَفتِ قَلبَکَ وَ لَو اَفتَاکَ المُفتُونَ۔** حضرت فاروق اعظمؓ کا ارشاد ہے: **مِن اٰخِرِ مَا نَزَلَ اٰیۃُ الرِّبٰوا وَ اَنّ رَسُولَ اللہِ صلی اللہ علیہ وسلم قُبِضَ قَبلَ اَن یُفَسِّرَھَا لَنَا فَدَعُوا الرِّبٰوا وَ الرِّیبَۃَ۔** حضرت فاروقِ اعظمؓ کا خطبہ حضرت ابوسعید خدریؓ نقل فرماتے ہیں: **اِنّی نھاکم عن اشیاء و تصلح لکم و اٰمرکم باشیاء لا تصلح لکم و انّ مِن اٰخر القراٰن نزولا اٰیۃ الربٰوا و انہ قد مات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم و لم یبیّنہ لنا فدعوا ما یریبکم الی**

مالا یریبکم۔ علامہ ابن کثیرؒ اور دوسرے مفسرین و فقہاء نے بھی لکھا ہے۔ ابن کثیر میں ہے:

وانما حرمت المخابرة وهي المزارعة ببعض مايخرج من الارض والمزابنة وهي اشتراء الرطب في رؤس النخل بالتمر على وجه الارض والمحاقلة وهي اشتراء الحب في سنبله في الحقل بالحب على وجه الارض وانما حرمت هذه الاشياء وما شاكلها حسما لمادة الربا لانه لا يعلم التساوي بين الشيئين قبل الجفاف ولهذا قال الفقهاء الجهل بالمماثلة كحقيقة المفاضلة ومن هذا حرموا اشياء بما فهموا من تضييق المسالك المفضية الى الربا والوسائل الموصلة اليه وتفاوت نظرهم بحسب ما وهب الله لكل منهم من العلم وقد قال تعالى وَفَوْقَ كُلِّ ذِي عِلْمٍ عَلِيمٌ وباب الربا من اشكل الابواب على كثير من اهل العلم وقد قال امير المؤمنين عمر بن الخطاب رضي الله تعالى عنه ثلاث وددت ان رسول الله صلى الله عليه وسلم عهد الينا فيهن عهدا ننتهي اليه الجد والكلالة وابواب من ابواب الربا ——— يعني بذلك بعض المسائل التي فيها شائبة الربا والشريعة شاهدة بان كل حرام فالوسيلة اليه مثله لان ما افضى الى الحرام حرام كما ان ما لا يتم الواجب الا به فهو واجب (تفسیر ابن کثیرؒ' ص ۵۸' جلد ۲)

"مخابرہ (کہ اس سے مراد ایسی مزارعت ہے جس میں مالکِ زمین اپنے لئے خاص قطعہ کی پیداوار کو مختص کر دیتا ہے) اور مزابنہ (جس سے مراد یہ ہے کہ درخت پر لگا ہوا کھجور کا پھل زمین پر پڑے ہوئے خشک چھواروں سے تبادلہ کیا جائے) اور محاقلہ (جس سے مراد ہے کہ کھیت میں کھڑی فصل جو خوشوں میں بند ہے اس کو زمین پر پڑے ہوئے غلہ کے بدلے میں خریدنا) یہ ساری صورتیں اور ان جیسی اور صورتیں اس لئے حرام کر دی گئیں تاکہ ربوٰا کی جڑ کٹ جائے' کیونکہ ان میں خشک ہو جانے سے قبل وزن و کیل میں مساوات معلوم نہیں ہو سکتی۔ یہ احتمال رہتا ہے کہ ایک طرف ہم جنس کے تبادلہ میں زیادتی ہو جائے گی' اور اس لئے فقہاءِ کرام نے اس مماثلت و مساوات کے معلوم نہ ہونے کو حقیقتاً کمی بیشی کے قائم مقام قرار دیا اور انہوں نے اس وجہ سے بہت سی ایسی صورتوں کو حرام قرار

دیا جہاں انہوں نے سمجھا کہ وہ تمام راستے جو ربٰوا تک آخر کار پہنچانے والے ہیں اور وہ تمام وسائل جو ربٰوا کے لئے ذریعہ بن سکتے ہیں ان میں تنگی کرنی چاہئے۔ اور اس بارے میں ان فقہاءِ کرام کی نگاہوں اور فیصلہ کرنے میں تفاوت اگر ہے تو وہ اس بناء پر ہے کہ اللہ تعالٰی نے ہر ایک کو جتنا علم عطا فرمایا ہے وہ اس کے مطابق دیکھتا اور فیصلہ کرتا ہے' کیونکہ ہر ایک علم والے سے بڑھ کر دوسرا علم والا ہوتا ہے۔ اور ربٰوا کا یہ باب اہلِ علم کے ہاں معاملات کے تمام ابواب سے زیادہ مشکل اور پیچیدہ ہے اور امیرالمومنین حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالٰی عنہ نے فرمایا ہے کہ تین مسئلے ایسے ہیں کہ میری خواہش تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کے بارے میں زیادہ واضح طور پر وصیت فرماتے: جد کی میراث مع الاخوۃ 'کلالہ سے مراد کیا ہے اور ربوا کے ابواب میں سے کچھ اور ابواب۔ اس سے مراد حضرت فاروقؓ کی یہ تھی کہ وہ تمام مسائل جن میں صریحاً ربٰوا تو نہیں مگر ربٰوا کا شائبہ ضرور ہے ان سب کی پوری تفصیل بیان فرماتے۔ اور شریعت اس بات کی گواہی دے رہی ہے کہ ہر وہ چیز جو حرام ہے تو جو بھی اس تک پہنچانے والا ذریعہ ہو تو وہ بھی حرام ہے' کیونکہ یہ اصولی بات ہے کہ جو حرام تک پہنچائے وہ بھی حرام ہوتا ہے' جیسا کہ یہ ایک اصولی قاعدہ ہے کہ ہر وہ چیز جس کے بغیر کوئی امرِ واجب تام نہیں ہو سکتا تو وہ بھی واجب ہوتی ہے"۔

امام جصاصؒ احکام القرآن میں لکھتے ہیں:

حظر أن یو خذ للاجل عوض فاذا کانت علیہ الف درھم مو جلہ فو ضع عنہ علی ان یجعلہ فانما جعل الحط بحذاء الاجل فکان ھذا ھو معنی الربا الذی نص اللہ تعالی علی تحریمہ و لا خلاف انہ لو کان علیہ الف درھم حالہ فقل لہ اجلنی و ازید ک فیھا مائۃ لا یجوز لان المائۃ عوض عن الاجل کذلک الحط فی معنی الز یادۃ اذ جعلہ عو ضًا عن الاجل و ھذا ھو الاصل فی امتناع جو از اخذ الابدال عن الآجل (احکام القرآن' ج ا'ص ۴۶۷)

ربا کو اللہ تعالٰی نے اس لئے منع فرمایا کہ اس میں میعاد کی وجہ سے اس کا عوض لیا جا رہا ہے۔ تو اگر کسی شخص کے دوسرے کے ذمہ ایک ہزار درہم ایک میعاد مقررہ

کو واجب الادا ہوں اور وہ اس سے کہے کہ میں اپنے دین میں اتنی مقدار کم کر دوں گا (مثلا دو سو درہم) اور باقی مجھے ابھی فوراً میعاد مقررہ سے قبل ادا کرو، تو اس صورت میں جتنی رقم کی کمی کی گئی ہے مثلا دو سو درھم کی، تو وہ اس میعاد کی وجہ سے ہے تو یہ بھی اس ربٰوا کے معنی میں ہے جس کے حرام ہونے کی اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں تصریح کی ہے۔ اور اس میں تو کوئی اختلاف نہیں ہے کہ اگر کسی کے ذمہ فوری واجب الادا ہزار درہم ہوں اور وہ مدیون کہہ دے کہ مجھے مثلاً دو ماہ کی میعاد دے دو اور میں ایک سو روپیہ اور مزید دے دوں گا تو یہ جائز نہیں، سود ہو گا۔ کیونکہ یہ سو روپیہ اس (دو ماہ) کی میعاد کا عوض دے رہا ہے۔ اسی طرح اپنے حق سے کچھ کم کر دینا بھی زیادتی کے معنی میں ہے کیونکہ اس میں بھی یہ دو سو روپیہ جو کم کیا جا رہا ہے اس میعاد کے ختم کر دینے کے عوض میں ہے۔ اور اصل بنیادی مسئلہ یہی ہے کہ میعاد کے مقابلہ میں اس کا مالی بدل لینا دینا جائز نہیں ہے۔

اور حضرات فقہاء کرام نے "کتاب الصلح" کے مسائل کے ضمن میں یہ جزئیہ بھی نقل کیا ہے، ھدایہ میں ہے:

ولو كانت له الف مؤجلة فصالحه على خمس مائة حالة لم يجز لان المعجل خير من المؤجل و هو غير مستحق بالعقد فيكون بازاء ما حط عنه و ذلك اعتياض عن الاجل و هو حرام

اس پر کفایہ شرح ہدایہ میں لکھا ہے:

قوله اعتياض عن الاجل و هو حرام و هذا لأنّ الاجل صفة كالجودة و الاعتياض عن الجودة لا يجوز فكذا عن الاجل الا ترى ان الشرع حرم ربا النسيئة و ليس فيه الا مقابلة المال بالاجل شبهة فلان يكون مقابلة المال بالاجل حقيقة حراماً اولی و الاصل فيه ان الاحسان متى وجد من الطرفين يكون محمولاً على المعاوضة كهذه المسئلة فان الدائن اسقط من حقه خمسمائة و المديون اسقط حقه في الاجل في الخمسمائة الباقية فيكون معاوضة بخلاف ما اذا صالح من الف على خمسمائة فانه يكون محمولاً على اسقاط بعض الحق دون المعاوضة لان الاحسان لم يوجد الا من طرف ربّ الدّين (کفایہ علی ہامش فتح القدیر، ج ۷، ص ۳۹۷)

شریعتِ اسلامی نے ربٰوا کے سلسلہ میں شبہ ربٰوا کو بھی حرام و ممنوع قرار دیا ہے۔ اس سلسلہ میں ابن قدامہ نے "المغنی" میں احادیث و آثار کی روشنی میں جو کچھ لکھا ہے اس کو پیشِ نظر رکھنا چاہئے:

قال ابن المنذر: اجمعوا علی ان المسلف اذا شرط علی المستلسف زیادۃ وھدیہ فاسلف علی ذلک ان اخذ الزیادۃ علی ذلک ربا۔۔۔۔۔۔ وان شرط فی القرض ان یوجرہ دارہ او یبیعہ شیئًا او ان یقرضہ المقترض مرۃ اخریٰ لم یجز لان النبی صلی اللہ علیہ وسلم نھی عن بیع و سلف ولانہ شرط عقدا فی عقد فلم یجز کما لو باعہ دارہ بشرط ان یبیعہ الاخر دارہ وان شرط ان یوجرہ دارہ باقل من اجرتھا او علی ان یستاجر دار المقرض باکثر من اجرتھا او علی ان یھدی لہ ھدیہ او یعمل لہ عملًا کان ابلغ فی التحریم وان فعل ذلک من غیر شرط قبل الوفاء لم یقبلہ و لم یجز قبولہ الا ان یکافئہ او یحسبہ من دینہ الا ان یکون شیئًا جرت العادۃ بہ بینھا قبل القرض لماروی الاثرم ان رجلًا کان لہ علی سمّاک عشرون درھمًا فجعل یھدی الیہ السمک و یقومہ حتی بلغ ثلاثۃ عشر درھمًا فسأل ابن عباسؓ فقال اعطہ سبعۃ دراھم و عن ابن سیرین ان عمر اسلف ابی بن کعب عشرۃ الاف درہم فاھدی الیہ ابی بن کعب من ثمرۃ ارضہ فردّھا علیہ ولم یقبلہ فاتاہ ابی فقال لقد علم اھلُ المدینۃ انی من اطیبھم ثمرۃ و انہ لا حاجۃ لنا فبم منعت ھدیتنا ثم اھدی الیہ بعد ذلک فقبل۔ و عن زر بن حبیش قال قلت لابی بن کعب انی ارید ان اسیر الی ارض الجھاد الی العراق فقال انک تاتی ارضًا فاشٍ فیھا الربٰو فان اقرضت رجلًا قرضًا فاتاک بقرضک لیؤدی الیک قرضک و معہ ھدیۃ فاقبض قرضک و اردد علیہ ھدیتہ رواھما الاثرم وروی البخاری عن ابی بردہ عن ابی موسی قال: قدمت المدینۃ فلقیت عبداللہ بن سلام و ذکر حدیثًا وفیہ ثم قال لی: انک بارض فیھا الربٰو الفشٍ فاذا کان لک علی رجل دین فاھدی الیک حمل تبن او حمل شعیر او حمل قت فلا تاخذہ فانہ ربٰو اقال ابن ابی موسیؒ: ولو اقرضہ قرضًا ثم استعملہ عملًا لم یکن یستعملہ مثلہ قبل القرض کان قرضا جر منفعۃً ولو استضاف غریمہ ولم تکن العادۃ جرت بینھما بذلک حسب لہ ما

اکلہ لما روی ابن ماجہ فی سننہ عن انس قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: اذا اقرض لحد کم قرضا فاھدی الیہ او حملہ علی الدابہ فلا یرکبھا ولا یقبلہ الا ان یکون جری بینہ و بینہ قبل ذلک و ھذا کلہ فی مدۃ القرض فاما بعد الوفاء فھو کالزیادۃ عن غیر شرط علی ما نذکرہ ان شاء اللہ تعالی۔ (المغنی' جلد ۴ ص ۲۴۰)

ابن المنذرؒ نے کہا ہے کہ اس پر اجماع ہے کہ قرض دینے والا اگر قرض مانگنے والے پر زیادتی کی یا کسی قسم کا ہدیہ دینے کی شرط لگا دے تو اس طرح قرض دے کر اس پر زیادہ لینا یا ہدیہ لینا یقیناً ربوٰا ہے۔ اور اگر قرض کے ساتھ یہ شرط لگا دی کہ قرض مانگنے والا ضرور اس کو اپنا مکان کرایہ پر دے گا' یا اپنی کوئی چیز قرض دینے والے پر ضرور فروخت کرے گا' یا یہ شرط لگا دے کہ قرض مانگنے والا اس قرض دینے والے کو پھر کبھی قرض دے گا تو یہ ساری صورتیں جائز نہیں ہیں' کیونکہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرض دینے اور ساتھ ہی چیز فروخت کرنے سے منع فرمایا ہے۔ اور یہ ایک عقد کے ساتھ دوسرے عقد کو مشروط کرنا ہے تو اس لئے جائز نہیں' جیسا کہ کوئی شخص اپنا مکان اس شرط پر ایک مشتری کے ہاتھ فروخت کر رہا ہے کہ وہ مشتری اپنا مکان اس پر فروخت کرے۔ اور اگر قرض دینے والا شخص قرض لینے والے پر یہ شرط لگا دے کہ وہ اپنا مکان اس کے کرایہ کی رقم سے کم مقدار کرایہ پر دے دے' یا یہ شرط لگا دے کہ میرا مکان اصل کرایہ سے زیادہ مقدارِ کرایہ پر لینا ہو گا' یا یہ شرط لگا دے کہ وہ کوئی ہدیہ دیا کرے گا' اس کا کوئی کام کرے گا' تو ان ساری صورتوں میں حرمت اور بڑھ جاتی ہے۔ اور اگر ان امور کی شرط نہ بھی لگائی ہو لیکن ابھی قرضہ ادا نہیں ہوا تو قرض دینے والے کو قبول نہیں کرنا چاہئے۔ ہاں اگر یہ اس کا بدلہ پورا کر کے دے یا اس کو اصل قرضے میں حساب کرتا رہے تو پھر جائز ہو جائے گا۔ چنانچہ اثرمؒ نے روایت نقل کی ہے کہ ایک مچھلی فروش کے ذمے ایک شخص کا قرضہ بیس درہم کا واجب الادا تھا۔ مچھلی فروش اس کے پاس بطور ہدیہ مچھلی لایا کرتا تھا۔ اور یہ ہر مچھلی کی قیمت لگاتا رہتا تھا۔ یہاں تک کہ مچھلیاں تیرہ درہم کی ہو گئیں تو اس نے

حضرت ابن عباسؓ سے مسئلہ پوچھا۔ انہوں نے فرمایا کہ تیرہ درہم تو مچھلیوں کی قیمت کی صورت میں وصول ہو گئے صرف سات باقی ہیں' وہ سات درہم قرضہ کے اس کو واپس کر دو۔ ابن سیرینؒ سے روایت ہے کہ حضرت عمرؓ نے حضرت ابی بن کعبؓ کو دس ہزار درہم قرض دیئے۔ حضرت ابیؓ اپنے باغ کا پھل بطور ہدیہ ان کے پاس لے گئے تو انہوں نے وہ ہدیہ واپس کر دیا اور قبول نہیں کیا۔ تو حضرت ابیؓ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ تمام اہلِ مدینہ کو یہ بات معلوم ہے کہ سب سے بڑھ کر عمدہ قسم کی کھجوریں میرے ہاں پیدا ہوتی ہیں اور مجھے ان کی اتنی ضرورت نہیں' اس لئے سارے احباب کو ہدیہ بھیجنا میرا معمول ہے (یعنی آپ کو اس قرض کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنے اس معمول کی وجہ سے ہدیہ بھیجا تھا)۔ جب حضرت عمرؓ کو ساری حقیقت بتا دی اور پھر ہدیہ بھیجا تب قبول کیا۔ زر بن حبیشؓ سے روایت ہے کہ میں نے حضرت ابی بن کعبؓ سے کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ جہاد کی سرزمین میں چلا جاؤں یعنی عراق جانا چاہتا ہوں۔ تو انہوں نے فرمایا کہ آپ ایک ایسے علاقے میں جا رہے ہیں جہاں سودی کاروبار عام طور سے پھیلا ہوا ہے۔ اس لئے یاد رکھو کہ اگر آپ نے وہاں کسی شخص کو قرض دیا اور پھر آپ کے پاس قرض کی وہ رقم ادا کرنے آیا اور اس کے ساتھ ساتھ کچھ ہدیہ بھی لے کر حاضر ہوا' تو اپنا اصل قرضہ تو اس سے لے لیا کرو اور اس کا وہ ہدیہ واپس کر دو۔ یہ دونوں روایتیں اثرمؒ نے روایت کی ہیں۔ اور امام بخاریؒ نے ابو بردہ سے' انہوں نے ابو موسیٰ اشعریؓ سے روایت کی ہے کہ میں (عراق سے) مدینہ منورہ آیا تو حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے میری ملاقات ہو گئی۔ ابو موسیٰؓ نے حدیث نقل کی ہے اور پھر اس میں یہ ذکر بھی کر دیا کہ حضرت عبداللہ بن سلام نے مجھے فرمایا کہ آپ ایسی سرزمین میں رہ رہے ہیں جہاں سودی لین دین عام ہے، تو جب کسی شخص پر آپ کا دین واجب الادا ہو اور وہ آپ کے پاس بھوسے کا گٹھا یا جو کا بوجھ یا کسی چارے کا بوجھ لے آئے تو اس سے وہ مت لیا کرو' کیونکہ یہ بھی ربوٰا ہے۔

ابن ابی موسیٰ کہتے ہیں کہ اگر کوئی شخص، کسی دوسرے شخص کو قرض دے' اور

پھر اس مقروض سے کوئی ایسا کام لے جس قسم کا کام اس کو قرضہ دینے سے پہلے نہیں لیا کرتا تھا۔ (اب قرضے کی وجہ سے وہ کام اس سے لے رہا ہے)' تو یہ ایک ایسا قرض ہے جس نے مقروض سے منفعت حاصل کی (اور قرض کی وجہ سے کوئی فائدہ مقروض سے حاصل کرنا جائز نہیں ہے۔) اور اگر مقروض کے ہاں جا کر مہمان ہوا اور قرض دینے سے قبل اس کے ہاں مہمان بن کر کھانے پینے کی عادت نہیں تھی تو ایسی صورت میں جس قدر کھایا ہے وہ اس قرضہ میں حساب کر دیا جائے' کیونکہ ابن ماجہ نے سنن ابن ماجہ میں روایت نقل کی ہے کہ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ جناب رسول اللہ صلی علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی شخص اگر کسی دوسرے کو قرض دے اور پھر وہ مقروض اس کو کوئی ہدیہ لا کر دیدے' یا اپنی سواری پر اس کو سوار کرا دے' تو نہ ہدیہ قبول کرے اور نہ سواری پر سوار ہو۔ ہاں اگر قرضہ لینے سے قبل ان دونوں کے درمیان ہدیہ بھیجنے اور سوار کرانے کا معمول تھا تو پھر خیر ہے۔ اور یہ سب کچھ اس وقت تک ہے کہ قرضہ واپس ادا نہ کیا گیا ہو' اگر مقروض قرضہ ادا کر کے فارغ ہو جائے تو پھر یہ لینا دینا ہدیہ سواری وغیرہ جائز ہو گا (المغنی ابن قدامہ' ج ۴' ص ۳۴۰)

عام طور پر ادھار سودا مہنگا فروخت کرنے کے شرعی جواز کے لئے یہ دلیل پیش کی جاتی ہے کہ فقہ کی کتابوں میں اس کو جائز لکھا ہے' اور یہ عبارت پیش کی جاتی ہے: **اندیز ادفی الثمن لاجل الاجل**۔ اس استدلال کے جواب میں عرض ہے کہ فقہاءِ کرام نے جواز کا یہ مسئلہ مستقل طور پر کہیں بھی نہیں لکھا ہے بلکہ ایک دوسرے مسئلے کے ضمن میں جو عبارت انہوں نے لکھی ہے اس ضمنی عبارت سے جواز کا یہ حکم مستنبط کیا جا رہا ہے۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ یہ استنباط جواز کے اثبات کے لئے درست نہیں' فقہاءِ کرام نے مرابحہ کے مسائل بیان کرتے وقت کتبِ فقہ میں ایک جزئیہ یہ لکھا ہے کہ مثلاً زید نے ایک گھوڑا کسی سے سال بھر کے ادھار پر دو ہزار کے بدلے خرید لیا ہے۔ اب زید وہ گھوڑا مرابحہ کے طور پر عمرو کے ہاتھ فروخت کرنا چاہتا ہے۔ اور باہمی رضامندی سے یہ طے ہوا کہ زید اصل قیمت خرید پر جو وہ بتائے گا مزید دو سو روپیہ منافع لے گا۔ تو اگر زید عمرو کو صرف اتنا کہے کہ یہ گھوڑا میں نے دو ہزار پر خریدا ہے اور دو سو روپیہ اپنا منافع لگا کر اس وقت آپ پر دو ہزار دو سو روپیہ نقد رقم

کے بدلے فروخت کرتا ہوں' تو مرابحہ کی یہ صورت صحیح نہیں ہے' کیونکہ زید نے تو سال بھر کی میعاد پر ادھار دو ہزار کے بدلے خریدا تھا۔ اس کو یہ چاہیے تھا کہ عمرو کو یہ بھی واضح کرے کہ میں نے دو ہزار پر نسیئۃً سال بھر کی میعاد پر خریدا ہے۔ اور یہ ادھار کا ذکر کرنا اس لئے مرابحہ کی صحت کے لئے ضروری ہے کہ ہو سکتا ہے کہ اگر زید اپنے بائع کو نقد رقم اس وقت دیتا تو گھوڑا اس کو ڈیڑھ ہزار میں ملتا۔ دو ہزار پر بائع نے اس لئے بیچا اور زید نے خریدا کہ ثمن کی ادائیگی سال بھر کے بعد ہو گی۔ اور عموماً ایسا ہوتا ہے کہ میعاد پر کوئی چیز فروخت ہوتی ہو تو اس کا ثمن زیادہ کیا جاتا ہے۔ اس لئے عمرو کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ زید نے گھوڑا ادھار پر خریدا ہے اور اس علم کے باوجود وہ دو ہزار دو سو روپیہ پر خریدنے کے لئے بخوشی آمادہ ہے اور نقد رقم دے رہا ہے تو اس موقع پر فقہاء یہ عبارت لکھتے ہیں: **الا تری انہ یزاد فی الثمن لاجل الاجل** "دیکھتے نہیں ہو کہ میعاد کی وجہ سے کسی چیز کے ثمن میں زیادتی کی جاتی ہے"۔ **لان للاجل شبھا بالمبیع** "کیونکہ میعاد کی بھی مبیع کے ساتھ مشابہت پیدا کی جاتی ہے"۔

بس اسی عبارت کو جو اس سیاق میں ہے جواز کے لئے دلیل قرار دیا جاتا ہے۔ مگر میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس عبارت میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ اس بناپر ہے کہ ایسا ہو جاتا ہے کہ کوئی چیز ادھار فروخت ہوتی ہو تو بیچنے والا اس میعاد کے پیشِ نظر قیمت میں کچھ اضافہ کیا کرتا ہے۔ یہ محض بیانِ واقعہ ہے۔ اس عبارت سے خود نہ جواز معلوم ہوتا ہے نہ عدمِ جواز۔ اس کے لئے ہمیں دوسرے دلائل کی طرف رجوع کر کے فیصلہ کرنا ہو گا کہ اس کو جائز کہیں یا ناجائز۔ اور اگر یہ مان لیا جائے کہ فقہ کی عبارت سے یہ مستنبط ہو سکتا ہے کہ یہ جائز ہے کہ ادھار پر کوئی چیز فروخت کی جاتی ہو تو بازاری قیمت سے بڑھ کر ثمن مقرر کیا جا سکتا ہے' تو اس صورت میں فقہاءِ کرام کا مقصد یہ ہرگز نہیں تھا کہ تاجر طبقہ مستقل طور سے اس کو کاروبارِ تجارت کا ایک عام طریقہ بنائیں' اور سود کے متبادل کے طور پر اس کو بازاروں' منڈیوں اور تجارتی اداروں میں اختیار کیا جائے' اور سود کا ایک حیلہ بنایا جائے۔ بلکہ ان حضرات کا مطلب صرف یہ تھا کہ اگر کسی خاص موقع پر کسی معقول وجہ کی بناء پر ادھار کا ثمن بازاری موجودہ قیمت سے بڑھ کر لیا جائے تو اس کی گنجائش اس وجہ سے ہے کہ وہاں اس اضافے کے لئے ایک معقول بنیاد موجود ہے۔ میں اس کو ایک مثال سے واضح کرتا ہوں۔ زید کے پاس ایک کتاب ہے جو اس نے اپنے علمی شوق کی بناء پر پچاس روپے میں خریدی ہے۔ اس وقت بازار میں عام طور پر وہ

پچاس روپیہ میں ملتی ہے' مگر وہ کتاب ایسی مقبول و مرغوب فیہ ہے کہ حالات کے اعتبار سے یہ قوی اندیشہ ہے کہ سال بھر کے بعد بازار میں عام طور پر یہ کتاب کم یاب یا نایاب ہو جائے گی اور اس وقت ساٹھ ستر میں بھی بمشکل مل سکے گی۔ عمرو کو فوری طور پر اس کتاب کی ضرورت ہے اور اسے خریدنا چاہتا ہے' مگر اس وقت اس کے پاس پچاس روپیہ نقد نہیں ہے کہ بازار جا کر خرید کر لے آئے۔ زید کے بارے میں اس کو یہ اعتماد ہے کہ میں اس کے سامنے خریدنے کا اور رقم فی الحال موجود نہ ہونے کا ارادہ ظاہر کروں تو وہ مجھے ادھار بھی دے دے گا۔ عمرو زید کے پاس آیا اور اس سے کتاب خریدنے کا ارادہ ظاہر کیا اور یہ بھی کہ میں ادھار لینا چاہتا ہوں۔ زید نے کہا کہ میں ادھار تو دے دوں گا مگر مجھے یہ خطرہ نظر آ رہا ہے کہ کچھ عرصہ بعد یہ کتاب کمیاب ہو جائے گی۔ مجھے خود یہ پسند ہے۔ سال بھر کے بعد میں پھر خریدنا چاہوں گا تو مجھے یہ پچاس روپیہ پر نہیں مل سکے گی' اس لئے میں آپ کو اس قیمت پر نہیں دے سکتا۔ عمرو کہتا ہے کہ میں بھی جانتا ہوں کہ یہ خطرہ یقینی ہے۔ آپ اپنا تحفظ کرنا چاہیں تو بے شک میں بخوشی اس پر آمادہ ہوں کہ آپ مجھے ساٹھ پر فروخت کریں۔ زید نے سوچا کہ اب اس کو ضرورت ہے' اس کی ضرورت پوری کر دوں گا' اور سال کے بعد مجھے جب ساٹھ روپیہ دے گا تو میں ساٹھ پر یا کچھ زائد پر خریدوں گا۔ چنانچہ زید اس وقت پچاس روپیہ والی کتاب عمرو کے ہاتھ ساٹھ روپیہ پر ادھار فروخت کرتا ہے تو یہ اضافہ اس معقول وجہ سے جائز ہو گا' زید کا یہ کاروبار اور عام معمول نہیں' ایک خاص موقع پر ایک خاص وجہ سے اس کو یہ صورت اختیار کرنی پڑی۔ اور فقہاءِ کرام کی عبارات سے جہاں کہیں جواز معلوم ہوتا ہے وہ اس نوعیت کی خاص صورتوں کے لئے ہے۔ یعنی کہیں اِکا دُکا ایسے واقعات ہوں' جن کی کوئی مناسب و معقول وجہ بھی ہوتی ہے ان کو ناجائز نہیں کہا جائے گا۔ مومنانہ ضمیر خود یہ فرق سمجھ سکتا ہے کہ خاص واقعات اور مسلسل کاروبارِ تجارت بنانے میں یہ فرق یقیناً موجود ہے' انہیں ایک دوسرے پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔

جو لوگ یہ کاروبار کرتے ہیں وہ اس کے جواز کے لئے ایک عذر بطور وجہِ جواز پیش کرتے کہ جو چیز آج مثلاً سو روپیہ کی بازار میں مل رہی ہے اور عام بک رہی ہے' ہو سکتا ہے کہ چھ ماہ بعد بازار میں اس کی قیمت ۱۲۰ ہو جائے۔ اگر آج ہم وہ چیز اس خریدار کو فروخت نہ کریں اور وہ چیز دکان میں پڑی رہنے دیں تو ہو سکتا ہے کہ وہ ہم ۱۲۰ میں فروخت کر کے مزید ۲۰ روپیہ

کمائیں۔ تو اگر آج ہی ۱۲۰ روپیہ اس کی قیمت طے کر کے فروخت کر دیں اور چھ ماہ بعد خریدار سے ۱۲۰ وصول کریں تو اس میں کیا حرج اور کیوں ناجائز ہے ------ لیکن ان کا یہ عذر اس مفروضہ پر مبنی ہے کہ وہ چیز چھ ماہ بعد ضرور ۱۲۰ روپے کی ہو جائے گی۔ حالانکہ عام اشیائے تجارت کے بارے میں مستقبل کے نرخوں کا کسی کو کوئی پتہ نہیں ہوتا کہ یہ مہنگی ہو جائیں گی' یہی قیمت بحال رہے گی یا قیمت کم ہو جائے گی۔ جس چیز کے بارے میں ایک تاجر فرض کر رہا ہے کہ چھ ماہ بعد ۱۲۰ کی ہو جائے گی' ہو سکتا ہے اور بارہا ایسا ہوتا بھی ہے کہ وہ سو روپیہ کی بجائے نوے یا اسی کی ہو جائے۔ اس چیز کو دکان پر رہنے دیا جاتا تو جس طرح ۱۲۰ کا احتمال ہے اسی طرح نوے اور اسی کا بھی احتمال ہے' تو چھ ماہ بعد اس کو نوے یا اسی بھی مل سکتے ہیں۔ پہلے سے لازماً ۲۰ روپیہ زائد متعین کرنا وہی سود خوارانہ ذہنیت ہے۔ جس طرح تجارتی کاروبار کے لئے قرض لینے کی صورت میں سود حرام ہے۔ حالانکہ وہاں بھی سود خوار طبقہ عموماً اپنے لئے اس سود کے جواز کی یہی دلیل دیتا ہے کہ یہ تاجر ایک لاکھ روپیہ ۱۵ فیصد شرحِ سود پر قرض لے کر اس ایک لاکھ کی رقم سے کاروبارِ تجارت کرتا ہے' اور تجارت میں عموماً ۳۰۔۳۵ فی صد کماتا ہے۔ تو اگر ۱۵ فی صد سود دے کر ۱۵۔۲۰ فی صد خود کماتا ہے تو اس سود میں گناہ کیوں ہے۔ آخر اس کی رقم سے اس نے کمایا تو رقم والے کو بھی حصہ ضرور ملنا چاہئے۔ حالانکہ یہ ساری بات اس مفروضہ پر کی جاتی ہے کہ وہ تاجر اس کاروبار میں ضرور ۳۰۔۳۵ فی صد کماتا ہی ہے۔ حالانکہ یہ محض مفروضہ ہی مفروضہ ہے۔ ورنہ بارہا ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ تاجر سال بھر کاروبار کر کے محنت کر کے کچھ بھی نہیں کماتا' یا اس کو تجارت میں کسی وجہ سے خسارہ ہو جاتا ہے اور تاجر کو بجائے منافع نقصان اٹھانا پڑتا ہے تو تاجر کو تو محنت مشقت کے باوجود کچھ بھی نہ ملا بلکہ الٹا دینا پڑا۔ اور سود خوار ہر خطرے سے بے پرواہ محض سرمایہ کی وجہ سے بیٹھے بیٹھے ۱۵ ہزار سود وصول کرتا رہے۔ تو سود خواروں کا یہ عذر اور جواز کے لئے یہ دلیل بالکل غلط ہے۔

تجارتی سود میں بھی وہ سارے مفاسد و مضرات ہیں جو صرفی سود میں ہیں۔ اور اب اس حقیقت کو سب نے تسلیم کیا ہے کہ سود خواہ ذاتی مصارف کے لئے لی ہوئی رقم پر ہو یا تجارتی کاروبار کی غرض سے لئے ہوئے قرض پر ہو' ہر صورت حرام اور موجبِ فسادِ معاشرہ ہے۔ پس جو خرابیاں اور برے نتائج سودی کاروبار کے ہیں وہ سب کے سب ادھار مہنگا فروخت

کرنے کے کاروبار میں ہیں۔ تو یہ اگرچہ ربٰوا حقیقی نہیں لیکن ربٰوا حکمی ضرور ہے۔ اگر ادھار مہنگا خریدنے والا اس چیز کو تاجر سے ذاتی استعمال کے لئے لے رہا ہو' تب بھی بائع ظلم کر رہا ہے کہ محض میعاد کی وجہ سے ثمن میں اضافہ کرکے ایک مجبور شخص کا استحصال کر رہا ہے اور یہ ظلم ہے۔ اور اگر خریدار عام بازاری قیمت سے مہنگا خرید کر آگے فروخت کرتا اور تجارت کر رہا ہے تو ظاہر ہے کہ وہ اس ثمن کو اصل قرار دے کر اس پر اپنا منافع لگائے گا' تو صارفین کو وہ چیز مہنگی ملے گی۔ یہ پہلا خریدار سینکڑوں صارفین سے زائد قیمت لے لے کر اس پہلے بائع کو پہنچا دیتا ہے۔ ایک شخص کو تو مالی فائدہ حاصل ہوتا ہے اور سینکڑوں ہزاروں کو نقصان پہنچ رہا ہے۔ فرض کیجئے کہ ایک چیز کی بازاری قیمت دس روپے ہے۔ ادھار کی وجہ سے بائع نے اس کی قیمت گیارہ روپیہ لگا دی اور ایک ہزار چیزیں دس ہزار کے بجائے گیارہ ہزار پر فروخت کر دیں۔ ہزار روپیہ زائد حاصل کیا۔ وہ خریدار اگر ایک روپیہ منافع لگاتا ہے تو وہ بجائے ۱۱ کے ۱۲ میں فروخت کرے گا' اور ایک ہزار گاہکوں سے فی کس ایک روپیہ زائد لے کر ہزار روپے اس بائع کو دے گا۔ اگر وہ اصل قیمت دس روپے پر دیتا تو گاہکوں کو ۱۱ روپے پر فروخت کر سکتا تھا' تو صارفین کا نقصان ہوا' اور اس خریدار نے درمیان میں واسطہ بن کر ہزار آدمیوں کی جیب سے ہزار روپیہ نکال کر اس ایک کی جیب میں ڈال دیئے۔ احادیث میں احتکار کو سخت تاکیدی الفاظ میں منع کیا گیا ہے' تلقی جلب کو ممنوع قرار دیا ہے' **بیع الحاضر للبادی** سے روکا گیا ہے۔ ان تمام امور سے اسلامی شریعت کا اصل مزاج معلوم ہو سکتا ہے کہ خاص شخص کا فائدہ جس میں ضرر عام ہو وہ برداشت نہیں کرتی۔ بلکہ شریعت کا مزاج تو یہ ہے کہ **یتحمل الضرر الخاص لاجل دفع الضرر العام!**

ھذا ما عندی واللّٰہ الموفق للصواب والسداد۔ وآخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العلمین والصلوٰۃ والسلام علی سید المرسلین و خاتم النبیین و علٰی آلہ و اصحابہ و ازواجہ و ذریاتہ اجمعین ○○

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے اشاعت کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔